ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری

چیئرمین اردو ڈیپارٹمنٹ، اورینٹل کالج، لاہور

راشد بنام صفیہ (چند غیر مطبوعہ خطوط)

Dr. Fakhar-ul-Haq Noori

Chairman Urdu Departmnet, Oriental College, Lahore

Rashid's Letters to Safia (Some unpublished Letters)

N.M.Rashed wrote a large number of letters to his first wife——Safia Sultana. These letters are very important due to the fact that these highlight the various aspects of Rashed's domestic and marital life. Many years ago, a few among these were published in a journal and afterward which were included by Nasim Abbas Ahmer in his compiled book. Nasrin Rashed, the elder daughter of N.M. Rashed, put together all these letters which were in her custody and published a compiled book, last year. Above mentioned letters were also included in this book. In the coming pages, six such letters to Safia are being published which were not published before and are new in this aspect.

گذشتہ سال اے آر پرنٹرز اسلام آباد سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کا سرنامہ ہے ___ 'ن م راشد کے خطوط، اپنی اہلیہ کے نام'۔ لگ بھگ دوسو چالیس (240) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ن م راشد (یکم اگست ۱۹۱۰ء-۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء) کے اپنی پہلی بیوی صفیہ سلطانہ (۵/اگست ۱۹۱۵ء-۱۹/اکتوبر ۱۹۶۱ء) کے نام تحریر کردہ ترپّن ۵۳ خطوط عکسی نقول کی صورت میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کتاب کے آخری حصّے میں چند یادگار تصویریں بھی شائع کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اسے ترتیب دینے میں مکتوب نگار و مکتوب الیہ کی بڑی بیٹی نسرین راشد نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ خطوط سے پیش تر انھوں نے بالترتیب ''فہرست'' اور ''میرے والد، ن م راشد'' کے زیرِ عنوان تعارفی نوعیت کی دو تحریریں شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ آٹھ ۸ صفحات پر مشتمل پہلی تحریر خطوط میں مذکور راشد کے اعزہ و اقربا کے مختصر تعارف اور موصوف کے ساتھ ان کے رشتہ و تعلق کی وضاحت پر مبنی ہے۔ یہ فہرست خطوط کی قائم کردہ زمانی ترتیب کے مطابق تیار کی گئی ہے اور اگر کسی شخص کا تذکرہ ایک سے زیادہ خطوں میں ہوا ہے تو اسے ہر خط کی ذیل میں متعارف کروایا گیا ہے جس سے بے جا تکرار پیدا ہو گئی ہے۔ اگر اس فہرست کے مندرجات زمانی کے بجائے الف بائی ترتیب میں ہوتے تو تکرار سے محفوظ رہنے کی صورت نکل سکتی تھی۔ یوں بھی ان کا بہتر محلِ تحریر حواشی تھے جو اس کتاب میں دیے ہی نہیں گئے۔ پانچ ۵ صفحات پر مشتمل دوسری تحریر میں راشد کے احوال و آثار اور ان کے اور ان کی

اہلیہ کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ سرسری طور پر ان کے چند بزرگوں، عزیزوں، بچوں اور بعض ملازموں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان معلومات کی افادیت اپنی جگہ مگر ان کی صحت اور پیشکش، دونوں کا بنظرِ تحقیق دیکھا جانا ضروری ہے۔ یہاں چند تسامحات کی نشاندہی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(i) راشد کی سب سے پہلی نظم ''انسپکٹر اور مکھیاں'' ہے جو انھوں نے صرف سات سال ساڑھے چار ماہ کی عمر میں اس وقت لکھی جب وہ دوسری جماعت کے طالب علم تھے۔ اس نظم کی عکسی نقل شعر و حکمت، راشد نمبر کے توسط سے چالیس سال پیشتر منظرِ عام پر آ گئی تھی۔(۱) نسرین راشد نے ایک تو غلطی سے اس کا عنوان تبدیل کر کے 'ہیڈ ماسٹر اور مکھیاں' درج کر دیا ہے اور دوسرے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ''اس نظم پر انھیں میڈل بھی دیا گیا تھا۔''(۲) یہ تو درست ہے کہ باپ دادا نے بچے کی حوصلہ افزائی کی تھی مگر میڈل والی بات نہایت مبالغہ آمیز ہے اور کسی ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

(ii) مختلف زبانوں سے راشد کی آگاہی کے حوالے سے تحریر کرتے ہوئے فرانسیسی زبان کے ضمن میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ ''انٹرمیڈیٹ تک اس زبان کا مطالعہ کیا''(۳) جس سے کچھ اور ہی تاثر ابھرتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ایم۔اے (معاشیات) کرنے کے بعد راشد نے اپنی بیکاری کے زمانے میں ''فرانسیسی زبان کی شبانہ کلاسوں میں شریک ہو کر انٹرمیڈیٹ کے مماثل امتحان'' پاس کیا۔(۴)

(iii) راشد کا چوتھا شعری مجموعہ ''گماں کا ممکن'' جو ان کی وفات کے ایک سال بعد نیا ادارہ لاہور سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا، اس کا سالِ اشاعت ۱۹۷۷ء بتایا گیا ہے۔(۵)

(iv) راشد کی ترجمہ کردہ کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''۱۹۳۹ء میں روسی زبان کے ناول 'یاما' کا اردو ترجمہ کیا۔'' (۶) جس سے یہ تأثر ملتا ہے کہ یہ ترجمہ براہِ راست روسی زبان سے کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ راشد نے ۱۹۴۵ء میں روسی زبان سیکھی مگر یہ ترجمہ تو اس سے چھے سال پہلے کا ہے۔ چنانچہ ترجمہ در ترجمہ کی مثال ہے کیونکہ بواسطہ انگریزی کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۳۹ء میں ہاشمی بکڈپو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ یاد رہے ناول کا مصنف معروف روسی ناول نگار الیگزینڈر کپرن (Alexandre Kuprin) تھا جو مذکور نہیں ہے۔

اسی طرح امریکی ناول نگار ولیم سیرویان (William Saroyan) کا ذکر کیے بغیر اس کے ناول کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ ''۱۹۵۶ء میں ایک ناول جس کا عنوان ہے 'Mama! I Love You' کا اردو ترجمہ کیا۔''(۷) حالانکہ درست سنہ ۱۹۶۲ء ہے۔ یاد رہے ''امی میں تمھاری ہوں'' کے نام سے کیا گیا یہ ترجمہ امریکی ادارے فرینکلن، نیویارک کے اشتراک سے مکتبۂ معین الادب لاہور نے شائع کیا تھا۔

نسرین راشد نے اس سے بھی بڑی غلطی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''انگریزی ناول Firmament of Time کا ترجمہ اردو میں کیا۔''(۸) حالانکہ "The Firmament of Time" کوئی ناول نہیں بلکہ امریکی ماہرِ انسانیات ڈاکٹر لورین آئزلے (Dr. Loren Eiseley) کے ارتقا (Evolution) کے موضوع پر دیے گئے لیکچروں پر مشتمل کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ ''وقت کا آسمان'' کے نام سے کیا گیا۔ یہ ترجمہ بھی فرینکلن کے اشتراک سے ۱۹۶۲ء ہی میں شائع ہوا۔ اشاعتی

ادارہ کلاسیک-لاہور تھا۔(۹)

(v) خاکسار تحریک سے وابستگی کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے کہ ''راشد صاحب خاکسار تحریک کے سپہ سالار بھی رہے۔''(۱۰) اس عبارت میں 'سپہ سالار' کی جگہ 'سالارِ شہر ملتان' ہونا چاہیے تھا۔ (۱۱)

(vi) اپنی والدہ کی تعلیم کے حوالے سے نسرین راشد نے معلوم نہیں کہاں سے یہ روایت لے لی ہے کہ ''... ایف۔اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ان کے ماموں امیر افضل جو فوج میں ملازم تھے، انھوں نے میری والدہ کو مزید تعلیم سے روک دیا۔ یہ کہہ کر کہ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے۔''(۱۲) دلچسپ بات یہ ہے کہ نسرین راشد نے تو موصوفہ کو ایف۔اے میں داخلہ ہی دلوایا ہے، شہریار راشد نے تو فرطِ جذبات میں انھیں ایف۔اے پاس ہی کروا ڈالا تھا۔ان کا بیان ہے:

''....وہ اپنے خاندان میں پہلی عورت تھیں، جس نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا۔'' (۱۳)

ان بیانات کی تصدیق کسی ذریعے سے نہیں ہوتی۔ راشد کے اعزہ واقربا کے مطابق صفیہ کی تعلیم مڈل سے زیادہ ہرگز نہ تھی۔اس ضمن میں ان کے بھائی محمود انور جنجوعہ سے بڑی سند کس کی ہوسکتی ہے؟ انھوں نے بھی راقم کے سوالنامے کا تحریری جواب دیتے ہوئے یہی لکھا تھا کہ ''ہمشیرہ مڈل پاس تھیں میٹرک یا انٹر نہیں۔''(۱۴) اور تو اور خود راشد نے بھی نسرین انجم بھٹی کو دیے گئے تحریری انٹرویو میں ان کی تعلیم مڈل تک ہی بتائی ہے۔لکھتے ہیں:

''صفیہ کی رسمی تعلیم غالباً مڈل تک ہوئی تھی۔لیکن گھر پر اپنی محنت سے انھوں نے اردو کی تعلیم خاصی حاصل کر لی تھی اور کچھ انگریزی کی بھی....''(۱۵)

ان حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ نسرین راشد کو اپنی والدہ کی تعلیم کے ضمن میں بھی تسامح ہوا ہے۔ان کی زیر بحث تحریر میں موجود اور بھی کئی بیانات تصدیق طلب ہیں۔اور ظاہر ہے کہ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں بتایا گیا، ''ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام'' میں کل ترپن ۵۳ خطوط شامل ہیں جنھیں عکسی نقول کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ دستاویزات کی تصدیق کے حوالے سے عکسی نقول خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن صرف انھی پر اکتفا کر لینا کافی نہیں ہوتا کیونکہ ایسا کرنا بہت سے قارئین کو امتحان میں ڈالنے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ عکسی نقول پیش کرنے کے باوجود دستاویزات کی کتابت/کمپوزنگ بھی ناگزیر قرار پاتی ہے۔خاص طور سے اس صورت میں کہ تحریر کنندہ نے خطِ شکستہ اختیار کیا ہو۔یہی معاملہ راشد کا بھی ہے۔ ان کی لکھائی ان کی طبیعت کی طرح بہت نفیس تھی مگر وہ خطِ شکستہ میں لکھنے کے عادی تھے۔کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان کے خطوط کی عکسی نقول کے پہلو بہ پہلو کتابت شدہ یا کمپوزڈ متن بھی شائع کر دیا جاتا۔

اگرچہ نسرین راشد نے اپنی کتاب میں پیش کردہ خطوط کی زمانی ترتیب قائم رکھنا چاہی ہے، تاہم اس معاملے میں بھی ان سے بعض کوتاہیاں سرزد ہوگئی ہیں۔اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ آخری دو خطوں کو چھوڑ کر کتاب میں شامل تمام مکاتیب کی پیشانی پر تاریخ و مقامِ تحریر کی صراحت موجود ہے۔اس کے مطابق پہلا خط ۱۹/جنوری ۱۹۳۶ء کو ملتان سے اس وقت لکھا گیا جب مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شادی کو صرف بیس دن گزرے تھے اور وہ جدائی کا کرب سہنے پر مجبور تھے۔ اکیاون واں خط ۱۰/دسمبر ۱۹۴۱ کو دلّی سے ارسال کیا گیا۔ یوں ان خطوط کا عرصۂ تحریر پانچ سال دس ماہ بائیس دن قرار پاتا ہے۔مکتوب نگار سے جن دو خطوں پر تاریخ و مقامِ تحریر درج نہیں ہو سکا، نسرین راشد نے داخلی

شواہد اور دیگر تحقیقی ذرائع بروے کار لا کر زمانی اعتبار سے ان کی صحیح جگہ متعین کرنے کے بجاے آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے انھیں آخر میں باون ویں اور ترپن ویں نمبر پر رکھ دیا ہے اور مقامِ تحریر بتانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یوں ایک مرتّب کے فرائض کی بجا آوری نہیں ہوتی۔ بہرحال آئندہ سطور میں دیکھا جا سکے گا کہ یہ دونوں خط اکیاون ویں خط مرقومہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۴۱ء سے پہلے کے تحریر کردہ ہیں اور اوپر بتائے گئے عرصۂ تحریر کے اندر ہی آتے ہیں۔

اس عرصۂ تحریر کو ذیلی طور پر دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ دورانیہ جب راشد ملتان میں قیام پذیر تھے۔ اس میں پہلے خط مرقومہ ۱۹؍جنوری ۱۹۳۶ء سے لے کر چالیس ویں خط مرقومہ ۲۶؍نومبر ۱۹۳۸ء تک، اُنتالیس ویں خط کے استثنا کے ساتھ، کُل اُنتالیس خط شامل ہیں۔ مذکورہ خطوط ملتان سے ارسال کیے گئے کیونکہ راشد اس زمانے میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں ملتان میں قیام پذیر تھے۔ یہ ایک معمولی ملازمت تھی جو زائد العمر (Overage) ہونے سے پہلے پہلے مجبوراً اختیار کی گئی تھی۔ راشد کے والد ملتان میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ ان کی کوشش سے راشد کمشنرز آفس ملتان میں ماہوار بیالیس روپے (معیّن) پر ریکارڈ کیپر کے طور پر ۲۱؍ستمبر ۱۹۳۵ء کو بھرتی ہوئے اور ۲۴؍نومبر ۱۹۳۵ء تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۲۵؍نومبر ۱۹۳۵ء کو وہ سینئر کلرک بنا دیے گئے اور یہ سلسلہ ۳۱؍اگست ۱۹۳۷ء تک جاری رہا۔ یکم ستمبر ۱۹۳۷ء کو انھیں عارضی طور پر 'اسسٹنٹ' کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جس پر انھوں نے ۳۰؍اپریل ۱۹۳۹ء تک کام کیا۔ (۱۶) بعد ازاں وہ آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

جیسا کہ بتایا گیا، نسرین راشد کی مرتبہ کتاب میں مشمولہ انتالیس ویں خط کو چھوڑ کر چالیس ویں خط تک تمام خطوط اسی دور کی یادگار ہیں۔ بقیہ خطوط بشمول خط نمبر انتالیس، یعنی کُل چودہ خطوط کا دورانیہ مختلف ہے۔ یہ اس زمانے میں قلمبند ہوئے جب راشد آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کر کے دہلی میں قیام پذیر تھے۔ 'پروگرام اسسٹنٹ' کی حیثیت سے اس ملازمت کا آغاز یکم مئی ۱۹۳۹ء کو لاہور اسٹیشن سے ہوا جہاں چند روزہ قیام کے بعد ۱۹؍مئی ۱۹۳۹ء سے راشد کا تقرر دہلی اسٹیشن پر کر دیا گیا۔ وہاں پورے تین سال تک وہ 'پروگرام اسسٹنٹ' کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹؍مئی ۱۹۴۲ء سے وہ ترقی پا کر ڈائریکٹر آف پروگرامز (جسے پروگرام ایگزیکٹو بھی کہا جاتا تھا) کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اس حیثیت سے وہ دہلی میں ۲۳؍نومبر ۱۹۴۳ء تک اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ پھر ان کی خدمات فوج میں مستعار لے لی گئیں۔ (۱۷)

اب ہم ان خطوں کی طرف آتے ہیں جنھیں زمانی ترتیب میں رکھتے ہوئے نسرین راشد سے تسامح ہوا ہے۔ اس ضمن میں پہلی کوتاہی تو یہ سامنے آتی ہے کہ انھوں نے انتالیس ویں خط اور چالیس ویں خط کی ترتیب الٹ دی ہے۔ جس خط کو انھوں نے انتالیس ویں نمبر پر رکھا ہے، اس پر مکتوب نگار کا پتا ''معرفت نیوز ایڈیٹر صاحب-آل انڈیا ریڈیو-۱۸/علی پور روڈ، دہلی'' مرقوم ہے (۱۸) جب کہ چالیس ویں نمبر پر شامل کیے گئے خط پر مقامِ تحریر 'ملتان' مندرج ہے۔ (۱۹) ہم سطورِ بالا میں جان چکے ہیں کہ راشد کا قیامِ ملتان کا دور، قیامِ دہلی کے دور سے پہلے آتا ہے۔ اس صورت میں دہلی سے بھیجا گیا خط ملتان سے ارسال کیے گئے خط سے پہلے کیسے لکھا جا سکتا تھا۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ انتالیس ویں خط پر مندرج تاریخ ۲۷؍مئی ۱۹۳۹ء کو غلطی سے ۲۷؍مئی ۱۹۳۸ء سمجھ کر اسے چالیس ویں خط مرقومہ ۲۶؍نومبر ۱۹۳۸ء سے پہلے جگہ دے دی گئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انتالیس واں خط کسی صورت میں بھی ۲۷؍مئی ۱۹۳۸ء کا مرقومہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ۱۹؍مئی ۱۹۳۹ء سے پہلے تو آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں راشد کا تقرر ہی نہیں ہوا تھا۔ راقم کو یقین ہے کہ ۳۹ میں موجود ۹ کے دائرے کا زیریں حصّہ اور اس کے ساتھ جڑا ہوا عمودی خط امتدادِ زمانہ سے مدھم پڑ گئے یا معدوم ہو گئے جن کا عکسی نقل میں نشان بھی نہ رہا اور یوں ۹ دیکھنے میں ۸ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء کو ۱۹۳۸ء

سمجھ لینے سے خطوں کی ترتیب الٹ گئی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ خط نمبر اکتالیس اور بیالیس کا بھی ہے مگر یہ دونوں خط راشد کے قیامِ دہلی کے دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں بھی اوّل الذکر کی تاریخ پڑھنے میں تسامح ہونے سے ترتیبِ معکوس میں درج کر دیا گیا ہے۔ اکتالیس ویں خط پر مندرج تاریخ کو ۲۳/اکتوبر ۱۹۴۱ء سمجھ لیا گیا ہے لیکن بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۳۰/اکتوبر ۱۹۴۱ء ہوگی۔ ۳ کے دندانے اور صفر کا نقطہ پھیل کر یوں مل گئے ہیں کہ ۲۳ کا اشتباہ ہونے لگا ہے۔ ممکن ہے نسرین راشد نے ایسا سمجھ کر مدھم ہندسوں کو عکس بنوانے سے پیشتر قلم لگایا ہو۔ بیالیس ویں خط پر واضح طور پر ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۱ء کی تاریخ مندرج ہے۔ اگر اکتالیس ویں خط کی تاریخ کو ۳۰/اکتوبر ۱۹۴۱ء مان لیا جائے تو اس کی درست جگہ بیالیس ویں خط کے بعد ہوگی۔ راقم کے موقف کی تائید دونوں خطوں کی ابتدائی عبارت دیکھنے سے ہو جاتی ہے۔ اکتالیس ویں خط میں مرقوم ہے:

> ''...خدا کا شکر ہے کہ میرے کاغذات ایک چپراسی کے پاس سے مل گئے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے دفتر کے کسی اور کمرے سے اٹھائے تھے۔ اور مجھے یاد نہیں کہ میں انھیں کسی اور کمرے میں بھی لے گیا تھا یا نہیں۔ یہ رجسٹر مل تو گئے لیکن اس وقت جب میں اپنی یادداشت ہی سے اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ اسی وجہ سے اس دفعہ شیڈول اچھا نہیں بن سکا۔ معلوم نہیں پسند کیا جائے گا یا نہیں۔'' (۲۰)

اور بیالیس ویں خط میں یہ الفاظ تحریر ہوئے ہیں:

> ''...میں عید کے دن دورے سے واپس آ گیا تھا لیکن بدقسمتی سے جو کچھ وہاں سے کر کے لایا تھا وہ سب کا سب یعنی تمام کاغذات اور رجسٹر وغیرہ کسی نے دفتر میں اٹھا لیے اور میں بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔ شِڈول بھیجنے کا وقت بہت نزدیک آ رہا ہے۔ اور میں ابھی تک اس طویل دورے کے باوجود کچھ تیاری نہیں کر سکا۔ اس وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ خدا مدد کرے۔'' (۲۱)

اور اب یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ کاغذات کی بازیابی ان کی گمشدگی سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ نسرین راشد کو چاہیے تھا کہ وہ محولہ بالا دونوں عبارتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان خطوں کی درست ترتیب قائم کرتیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، نسرین راشد نے دو خطوں کو، تاریخ و مقامِ تحریر مندرج نہ ہونے کے باعث کتاب کے آخر میں باون ویں اور ترپن ویں خط کے طور پر شامل کر دیا ہے۔ اگر ہم باون ویں خط کے مندرجات کو دیکھیں تو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خط دہلی سے ارسال کیا گیا۔ اس میں راشد اپنی نوزائیدہ بیٹی نسرین (جو زیرِ بحث کتاب کی مرتّب ہیں) کی بیماری کے باعث بہت پریشان ہیں۔ (۲۲) اس حوالے سے ۲۶/نومبر ۱۹۴۱ء اور ۲۷/نومبر ۱۹۴۱ء کے خط بھی (یعنی خط نمبر انچاس اور پچاس) دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ باون واں خط بھی انھی خطوں کے آس پاس کی تاریخ میں لکھا گیا۔ تاریخ کا تعیّن کرنا مشکل بھی تھا تو ماہ و سال کا تعیّن تو کیا ہی جا سکتا تھا۔ جہاں تک ترپن ویں خط کا تعلق ہے، یہ ایک عید کارڈ پر لکھا گیا ہے اور اس پر بھی تاریخ و مقامِ تحریر مندرج نہیں ہے۔ یہ بھی قیامِ دہلی کے دور سے متعلق ہے مگر میرٹھ سے لکھا گیا ہے، جہاں راشد کسی محکمانہ ضرورت سے گئے تھے۔ آغاز میں رقمطراز ہیں:

> ''میں عید کل میرٹھ میں گزار رہا ہوں۔ اگر تم ہوتیں تو بھاگ کر دہلی پہنچتا۔'' (۲۳)

سب جانتے ہیں کہ عید کارڈ بھیجنے کا رواج عیدالاضحیٰ کے ساتھ نہیں، عیدالفطر کے ساتھ منسلک چلا آتا ہے۔ اور تقویمِ ہجری و عیسوی

کی مطابقت کی رُو سے ۱۹۴۱ء میں عید الفطر یعنی یکم شوال المکرّم ۱۳۶۰ھ کی تاریخ ۲۲/اکتوبر بروز بدھ تھی۔(۲۴) چناچہ اس خط کی تاریخِ تحریر ۲۱/اکتوبر ۱۹۴۱ء قرار پاتی ہے۔اگرچہ ایک آدھ دن کا فرق بھی ہوسکتا ہے،تاہم درست تاریخ کا تعین پھر بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ راقم کو ۱۹۴۱ء کے سنہ پر کیوں اصرار ہے۔تو اس کا جواب کتاب میں شامل بیالیس ویں خط سے مل جاتا ہے جو دہلی سے ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لکھا گیا۔اس کے ابتدائی جملے دیکھیے:

''تمھارا محبت بھرا عید کارڈ یا 'عید رومال' مل گیا۔میں بے حد خوش ہوں کہ اب تم تندرست ہو۔میں عید کے دن دورے سے واپس آ گیا تھا...''(۲۵)

اس سے ظاہر ہے کہ ترپن واں خط کتاب میں شامل بیالیس ویں خط مرقومہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۱ء سے پہلے ہی لکھا گیا ہوگا۔

مذکورہ بالا تمام تسامحات کے باوجود نسرین راشد کلماتِ تشکر کی مستحق ہیں کہ ان کی اس کاوش سے راشد کے بہت سے ایسے غیر مطبوعہ خطوط منظرِ عام پر آ گئے جن سے ان کی نجی اور ازدواجی زندگی کے بہت سے مخفی گوشے سامنے آ گئے ہیں۔

نسرین راشد کی مرتب کردہ کتاب 'ن م راشد کے خطوط، اپنی اہلیہ کے نام' میں شامل ترپن خطوں میں سے نو[9] خط ایسے ہیں جو اس سے پیشتر بھی دو بار شائع ہوئے۔ظاہر ہے کہ پہلی بار یہ خط نسرین راشد ہی سے حاصل کر کے شائع کیے گئے ہوں گے۔ان نو خطوں میں سے اوّلاً آٹھ خط کلاسیک- راولپنڈی، بابت جنوری ۱۹۸۶ء میں احمد داؤد اور ظہیر الدین احمد نے مرتب کر کے شائع کیے۔(۲۶) انھیں بہ ترتیبِ ذیل شائع کیا گیا۔

نمبر شمار	تاریخِ تحریر	نسرین راشد کی مرتبہ کتاب میں نمبر
۱۔	۵/جنوری ۱۹۳۸ء (عکس)	۳۴
۲۔	فروری ۲۸، ۱۹۳۶ء	۱۰
۳۔	۲۶/نومبر ۱۹۳۸ء	۴۰
۴۔	۳۰/جنوری ۱۹۳۶ء	۲
۵۔	۲/مارچ ۱۹۳۶ء	۱۱
۶۔	اپریل ۱۲، ۱۹۳۶ء	۱۹
۷۔	یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء	۲۴
۸۔	اکتوبر ۵، ۱۹۳۶ء	۲۵

جیسا کہ نسرین راشد کی مرتبہ کتاب میں قائم کی گئی ترتیب دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے، احمد داؤد اور ظہیر الدین احمد ان خطوں کی زمانی ترتیب برقرار رکھنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔چونکہ پہلا خط عکس کی صورت میں شائع کیا گیا ہے اس لیے اس کی بے ترتیب اشاعت کا تو پھر بھی جواز نکالا جا سکتا ہے مگر بقیہ خطوط کی ترتیب کا غلط ہونا چوتھے خط سے آٹھویں خط تک یعنی پانچ خطوں کا سنہ پڑھنے میں فاش غلطی کرنے کا نتیجہ ہے۔مرتبین نے ۱۹۳۶ء میں لکھے گئے ان پانچوں خطوں کا سنہِ تحریر ۱۹۴۶ء سمجھ لیا ہے اور اسی کی مناسبت سے ترتیب قائم کر دی ہے۔چنانچہ مذکورہ اشاعت میں ان پانچوں خطوں پر ۱۹۴۶ء ہی کا سنہ دکھائی دیتا ہے۔مرتبین نے اس ضمن میں قطعی طور پر ایسی کوئی کاوش نہیں کی جس

سے انھیں راشد کے قیامِ ملتان اور قیامِ دہلی کے دورانیوں کا علم ہو جاتا اور وہ درست سنہ تحریر تک پہنچ جاتے۔

آٹھ[۸] خطوں کی مذکورہ طباعت کے بعد ایک خط مرقومہ ۲۳/فروری ۱۹۳۸ء جو نسرین راشد کی مرتبہ کتاب میں سینتیس ویں نمبر پر موجود ہے، پہلی بار ۲۰۰۶ء میں ادبیات-اسلام آباد کے ایک شمارے میں اشاعت پذیر ہوا۔(۲۷) یہ خط بھی یقیناً نسرین راشد ہی سے حاصل کیا گیا۔

ان نو[۹] خطوں کو کلاسیک- راولپنڈی اور ادبیات- اسلام آباد کی مذکورہ اشاعتوں سے لے کر نسیم عباس احمر نے اپنی مرتب کردہ کتاب 'ن م راشد کے خطوط' میں بعنوان 'صفیہ (پہلی بیوی) کے نام' شامل کر دیا جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔(۲۸) جہاں تک کلاسیک- راولپنڈی میں طبع ہونے والے آٹھ خطوں کا تعلق ہے، نسیم عباس نے انھیں اپنی کتاب میں ترتیب دیتے ہوئے مکھی پر مکھی مارنے کا مظاہرہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ مقامِ تحریر پر راشد کے قیام کی مناسبت سے درست سنہ کا تعیّن کرنے کی کوشش کرتے، انھوں نے بھی آخری پانچوں خطوں پر ۱۹۳۶ء کی جگہ ۱۹۴۶ء ہی کا سنہ درج کرنے کی غلطی دہرا دی ہے۔ پہلے تین خطوں کی ترتیب میں مرتب نے درستی کرنے کی ایک سعیِ لاحاصل ضرور کی ہے۔ وہ یہ کہ کلاسیک- راولپنڈی میں عکس کی صورت میں چھپنے والے پہلے خط کا دوسرے خط کے ساتھ تبادلہ کر دیا ہے۔ بقیہ ترتیب جوں کی توں ہے۔ جہاں تک نویں خط کا تعلق ہے، اسے موجودہ صورت میں بھی زمانی ترتیب میں رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ آخر میں چھاپ دیا گیا ہے۔ سونے پر سہاگہ کمپوزنگ کی غلطیاں ہیں جو ہر جگہ بکھری پڑی ہیں۔

صفیہ کے نام لکھے گئے، راشد کے چھے[۶] خط ایسے بھی ہیں جو مذکورہ بالا اشاعتوں میں شامل نہیں ہو سکے اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ خط ۱۹۹۱ء میں راشد کے چھوٹے بھائی فخرِ محمد ماجد سے اس وقت حاصل ہوئے تھے جب راقم نے 'ن م راشد- تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' کے زیرِ عنوان ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیق کا آغاز کیا تھا۔ چنانچہ کم و بیش بیس[۲۰] سال سے محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔	یکم جون ۱۹۳۷ء	از ملتان
۲۔	۲۰/اکتوبر ۱۹۵۲ء	از نیویارک
۳۔	۲۱/اکتوبر ۱۹۵۲ء	ایضاً
۴۔	۲۴/اکتوبر ۱۹۵۲ء	ایضاً
۵۔	۳/نومبر ۱۹۵۲ء	ایضاً
۶۔	۱۰/نومبر ۱۹۵۲ء	ایضاً

جہاں تک پہلے خط کا تعلق ہے، یہ راشد کے قیامِ ملتان کے دور سے متعلق ہے جب وہ کمشنرز آفس میں معمولی ملازمت کر رہے تھے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔ چونکہ یہ خط شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد کا ہے، اس لیے اس میں ازدواجی محبت کا وہی والہانہ پن اور گرم جوشی دکھائی دیتی ہے جو اس زمانے میں لکھے گئے اکثر خطوں میں موجود ہے۔ بقیہ پانچوں خط ۲۰/اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ۱۰/نومبر ۱۹۵۲ء تک یعنی صرف بائیس[۲۲] دنوں میں نیویارک (امریکا) سے '۴۹۔ مال روڈ، پشاور، پاکستان' کے پتے پر ارسال کیے گئے۔ یہ ان دنوں کی یادگار ہیں جب راشد ریڈیو پاکستان پشاور سے ریجنل ڈائریکٹر کا عہدہ چھوڑ کر ڈیپوٹیشن پر اقوامِ متحدہ (United Nations) کی ملازمت میں چلے گئے تھے۔ سروس فائل کے مطابق وہ ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ریڈیو پاکستان پشاور سے منسلک رہے۔ اقوامِ متحدہ میں ان کا پہلا تقرر صدر مقام (Head Quarter) نیویارک میں ہوا جہاں انھوں نے اپنے فرائض ۱۹/اکتوبر ۱۹۵۲ء سے سنبھالے۔ یہاں وہ ۳۱/دسمبر

۱۹۵۶ء تک یعنی چار سال اور اڑھائی ماہ تک جنوب مشرقی ایشیا کے لیے ریڈیو پروگرامز کے انچارج کے طور پر افسرِ اطلاعات (Information Officer) کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔شروع شروع میں ان کی ذمہ داری اردو خبروں کی تیاری اور انھیں نشر کرنے سے متعلق تھی۔(۲۹) یہ پانچوں خطوط راشد کے نیویارک پہنچنے کے بعد ابتدائی دنوں میں لکھے گئے۔ان دنوں ان کے اہلِ خانہ نے ابھی پشاور سے نقل مکانی نہیں کی تھی۔ان خطوں میں راشد نے اپنی رہائش گاہ اور اپنے دفتر کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اپنے بعض رفقائے کار کا تعارف کروایا ہے۔مزید یہ کہ انھوں نے اپنے محکمانہ فرائض اور نجی معمولات کے ساتھ ساتھ نیویارک کے جدید طرزِ زندگی کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ان خطوں میں جہاں کشادہ فضاؤں میں پرواز کرنے کی سرشاری نظر آتی ہے وہاں بیوی بچوں سے دور ہونے کے باعث طاری ہونے والی اداسی بھی سنائی دیتی ہے۔

آئندہ صفحات میں ان خطوط کو پہلی بار قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ ان کے متن کا اندراج پوری صحت کے ساتھ عمل میں لایا جائے۔متن کے بعد ضروری حوالہ جات وحواشی بھی درج کر دیے گئے ہیں تا کہ قارئین کو ادھورے پن کا احساس نہ رہے۔اور آخر میں ان خطوں کا عکس بھی دے دیا گیا ہے جس سے متن کے تقابل کی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔لیکن اس سے پہلے کہ یہ سب کچھ پیش کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راشد اور صفیہ کی ازدواجی زندگی اور اس کے ثمرات یعنی بچوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں تا کہ کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہے۔

صفیہ سلطانہ راشد کے ماموں مولوی عبدالرسول کی صاحبزادی تھیں۔ان کے ساتھ راشد کی شادی ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو گوجرانوالے کے علاقے سیدنگری میں ہوئی جہاں ان کے ماموں اور خسر کی رہائش گاہ واقع تھی۔راشد کا ولیمہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو اکال گڑھ، ضلع گوجرانوالا میں اپنے جدی مکان میں ہوا۔جس روز ان کا ولیمہ تھا، اسی روز ان کی ہمشیرہ ممتاز جہاں کی رخصتی تھی۔راقم کو یہ تاریخیں انھی سے معلوم ہوئی تھیں اور راشد کے برادرِ نسبتی محمود انور جنجوعہ نے بھی ان کی تصدیق کی تھی۔راشد کی تاریخِ ولادت یکم اگست ۱۹۱۰ء ہے جبکہ نسرین راشد نے صفیہ کی تاریخِ ولادت ۵ر اگست ۱۹۱۵ء لکھی ہے۔(۳۰) اس لحاظ سے دونوں کی عمروں میں پانچ سال کا تفاوت تھا۔شادی کے وقت راشد پچیس سال، پانچ ماہ جبکہ صفیہ بیس سال پانچ ماہ کی تھیں۔

اگرچہ راشد کی شادی والدین کی پسند سے ہوئی تاہم اس میں ان کی اور ان کی اہلیہ کی مرضی بھی شامل تھی۔اہلیہ کے بارے میں راشد نسرین انجم بھٹی کو دیے گئے تحریری مصاحبے میں لکھتے ہیں:

> ''خاندان میں مشہور تھا کہ انھوں نے جب سے آنکھ کھولی ہے میرے عشق میں مبتلا چلی آتی ہیں۔''(۳۱)

لیکن یہ کہہ کر راشد خود صاف بچ کر نکلنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔وہ خود بھی صفیہ کو چاہتے تھے۔خواہ اس چاہت کی نوعیت کچھ بھی ہو۔شادی کے بعد صفیہ کے نام ۳۰ر جنوری ۱۹۳۶ء کو لکھے گئے خط میں وہ خود اپنی محبت کا اعتراف کرتے ہیں:

> ''تمھیں اس بات کا علم ہو یا نہ ہو، میں نے تمھیں شادی سے پیشتر بھی دل سے چاہا ہے لیکن خاموشی کے ساتھ۔کسی قسم کے اوچھاپن کے بغیر...میں تمھیں اس تمام پاکیزگی اور اس تمام وقار کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا جو ایک بیوی اور ایک میاں کو سزاوار ہے۔جن کے جسم کی شعاعوں سے ایک 'گھر' کی تعمیر ہوتی ہے...''(۳۲)

شہریار راشد نے بھی والدین کے مابین شادی سے قبل کے لگاؤ کا ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''...میرا خیال ہے کہ دونوں میں بچپن سے ایک لگاؤ چلا آ رہا تھا۔ اسے آپ چاہیں تو ان گھڑ قسم کی محبت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں...'' (۳۳)

یوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس شادی میں بزرگوں کی پسند کے ساتھ ساتھ میاں بیوی، دونوں کی مرضی کو بھی دخل تھا۔

صفیہ کے والد اپنے باپ دادا کی طرح کٹر مذہبی آدمی تھے اور اسی لیے مولوی کہلاتے تھے۔ والدہ بھی بہت متدین اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ صفیہ انھی کی طرح مذہب سے لگاؤ رکھنے والی، وفا شعار و خدمت گزار اور سادہ سی گھریلو عورت تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی بچیوں کو زیادہ تعلیم دلوانے کا رواج نہیں تھا، اس لیے صفیہ بھی ابتدائی گھریلو تعلیم و تربیت اور سکول میں مڈل سے آگے نہ بڑھ سکیں، جس کے بارے میں گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اگرچہ راشد اور صفیہ، دونوں کی تعلیم میں بہت فرق تھا، تاہم صفیہ سیرت و کردار کے لحاظ سے بھی راشد کے نزدیک قابلِ قبول تھیں اور شکل و صورت کے اعتبار سے بھی اچھی تھیں۔ راشد ان کی شباہت میں دلکشی محسوس کرتے تھے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں خاص طور سے ایسا تھا۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۳۶ء ہی کو لکھے گئے خط میں رقمطراز ہیں:

''صفیہ، تمھیں کسی طرح اس بات کا رنج نہیں ہونا چاہیے کہ تم نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ یہ بات میری محبت میں کسی طرح حائل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میں خوش ہوں کہ یہی بات کہ تم نے سکول میں اپنی عمر کا کثیر حصّہ ضائع نہیں کیا، تمھیں بہتر بیوی اور بہترین رفیق حیات بنائے گی۔ ہاں مجھے تمھاری ملاقات سے پیشتر اس بات کا یقین نہ تھا کہ تمھاری صورت میں اتنی دلکشی بھی ہے۔ اب میں نہ صرف تمھاری دلفریبی سے متاثر ہوں بلکہ مجھے یقین ہے کہ تم ایسی سیرت کی مالک ہو کہ تم میں کچھ اور خامیاں ہوں تو بھی تم میری محبت حاصل کر سکتی ہو۔'' (۳۴)

راشد کئی مقامات پر صفیہ کی تعلیمی قابلیت میں کمی کو نظر انداز کرنے اور ان کے ذہن سے اس احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ذہن کے کسی گوشے میں وہ خود بھی اس کمی کو محسوس کرتے تھے۔ ۲۸ر فروری ۱۹۳۶ء کے مرقومہ خط میں صفیہ کو لکھتے ہیں:

''...میں چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے، جس قدر تعلیم حاصل کی ہے، وہ تمھیں بھی سکھا دوں تا کہ ہمارے دل اور زیادہ ہم آہنگ ہو جائیں۔ اور ہم ایک ازلی و ابدی محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں۔'' (۳۵)

بہر حال یہ تعلیمی تفاوت ان کے مابین کسی مسئلے کی صورت اختیار نہ کر سکا۔

راشد اور صفیہ میں تقریباً ۲۶ سال کی رفاقت رہی۔ اس دوران میں ان کے ہاں پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا، یعنی کل چھے بچے پیدا ہوئے۔ پہلی بچی چند ماہ کی عمر میں چل بسی۔ اس بچی کے بارے میں مجھے راشد کی بہن ممتاز جہاں اور بھائی فخر محمد ماجد وغیرہ سے جو تفصیل معلوم ہوئی تھی، اس کے مطابق یہ بچی ۱۹۳۷ء میں ملتان میں پیدا ہوئی اور چار پانچ ماہ کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں سرگودھا میں انتقال کر گئی۔ اس کے گھٹنوں اور بازوؤں کے جوڑ نہیں تھے اور پاؤں الٹے تھے۔ اس بچی کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ نام سے بھی کوئی آگاہی نہیں ہے۔ بلکہ نام کے بارے میں یہ قیاس ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان انکی ہوئی بچی کا نام رکھنا بھی غیر ضروری سمجھا گیا ہوگا۔ باقی بچوں کے بارے میں مذکورہ شخصیات اور ان کے علاوہ دیگر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق پہلے یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں ہیں۔ ان کے بعد ایک بیٹا اور آخر میں پھر ایک بیٹی ہے۔

راشد کی سب سے بڑی بیٹی نسرین راشد ہیں جو ۱۲ر جنوری ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئیں۔ یہ ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں اکاؤنٹس کے شعبے میں ملازمت کرتی رہی ہیں۔ انھیں دو بار تاہّل اختیار کرنے کے ناکام تجربوں سے گزرنا پڑا اور یہ بے اولاد ہیں۔ ان کی رہائش اسلام آباد میں ہے۔

دوسری بیٹی کا نام یاسمین راشد ہے۔ ان کی پیدائش ۴ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔ ان کی شادی اپنے پھوپھی زاد فاروق حسن کے ساتھ ہوئی جو راشد کی بہن ممتاز جہاں کے بیٹے ہیں۔ راشد کے بچوں میں صرف انھی کی شادی خاندان میں ہوئی۔ ان کے دو بچے ہیں جن میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ یہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مانٹریال (کینیڈا) میں مقیم ہیں جہاں انھوں نے اپنی ملازمتوں کے باعث زندگی کا ایک طویل عرصہ گزار دیا ہے۔

شاہین راشد تیسری بیٹی ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش ۶ر جولائی ۱۹۴۳ء بتائی جاتی ہے۔ یہ واشنگٹن (امریکا) میں پاکستانی سفارت خانے میں ملازمت کرتی رہی ہیں۔ ان کی شادی ان کے رفیقِ کار عنایت اللہ شیخ سے ہوئی۔ ان کے بھی دو بچے یعنی ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ شاہین راشد دسمبر ۲۰۰۵ء میں جارجیا (امریکا) میں وفات پا گئیں۔

ان تینوں بیٹیوں کے بعد راشد کے بیٹے شہریار راشد کا نمبر آتا ہے جو ۱۹ر جنوری ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے امتیازی حیثیت سے ایم۔اے انگریزی کرنے کے بعد سی۔ایس۔ایس کا امتحان پاس کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر فارن سروس میں چلے گئے۔ یہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں برسلز (بلجیم) ہیگ (ہالینڈ) بمبئی (بھارت) اور دیگر مقامات پر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے وقت کی مشہور پاکستانی اداکارہ سورن لتا کی بیٹی عفت کے ساتھ محبت کی شادی کی جو ان کی ہم جماعت تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ شہریار راشد کو شعر گوئی کا ملکہ ورثے میں ملا۔ ان کا ذریعۂ اظہار انگریزی ہے اور انگریزی میں ان کے دو شعری مجموعے ''Hybrid'' اور "Liquid Clocks" منظرِ عام پر آ چکے ہیں جنھیں المآب پرنٹرز لاہور نے بالترتیب ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔ ۷ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو وہ ازبکستان میں دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گئے جہاں وہ سفیر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی تدفین لاہور میں ہوئی۔

شہریار راشد کے بعد صفیہ کے بطن سے راشد کی ایک اور بیٹی ہیں جن کا نام تمزین راشد ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۳۱ر مارچ ۱۹۵۳ء ہے۔ یہ پاکستان سے زیادہ تر باہر ہی رہی ہیں۔ انھوں نے جان نامی ایک عیسائی سے شادی کی۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ وہ طویل عرصے تک برسلز (بلجیم) میں مقیم رہیں۔ آج کل سٹیونگر (ناروے) میں رہائش پذیر ہیں۔ (۳۶)

اگرچہ راشد اپنی مختلف ملازمتوں کے باعث ملک کے مختلف شہروں کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے متعدد شہروں میں نقل مکانی کرتے رہے تاہم جہاں تک ممکن ہو سکا صفیہ اور جو بچے پیدا ہوتے گئے، ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ جہاں راشد کے لیے ایسا کرنا دشوار ہوتا، وہ بیوی بچوں کو اپنے والدین کے پاس چھوڑ جاتے۔ اس ضمن میں راشد نسرین انجم بھٹی کو دیے گئے تحریری مصاحبے میں لکھتے ہیں:

> ''صفیہ میرے ساتھ ملتان، لاہور، دہلی، لکھنؤ، پشاور، مری، کراچی اور نیویارک میں رہیں۔ جب میں فوج کی ملازمت کے سلسلے میں مشرق وسطیٰ یا سیلون میں تھا تو میرے ساتھ نہ جا سکیں۔ انڈونیشیا میں بھی مکان کی قلت اور اسکولوں کی کمی کی وجہ سے وہ اور بچے پاکستان ہی میں رہے۔ میرے فوج کے زمانے میں انھوں نے بیشتر وقت پاٹودی میں گزارا جہاں والد ریٹائر ہونے کے بعد اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے تھے۔ اور میرے انڈونیشیا کے زمانے میں وہ بچوں کے ساتھ لاہور میں چند دن مستی دروازے کے اس مکان میں رہیں جو والد نے کرائے پر

لے رکھا تھا۔ اور بعد میں جب انھوں نے اپنا مکان سمن آباد میں خرید لیا، اس میں منتقل ہو گئیں۔'' (۳۷)

انڈونیشیا کے بعد اقوام متحدہ کی ملازمت کے سلسلے میں راشد کا تقرر کراچی (پاکستان) میں (یکم ستمبر ۱۹۵۹ء تا وسط دسمبر ۱۹۶۱ء) ہوا تو بیوی بچوں کے ان کے پاس رہنے کا موقع پیدا ہو گیا۔ چنانچہ راشد کے اہلِ خانہ کراچی منتقل ہو گئے، البتہ ان کی دوسری بیٹی یاسمین اور تیسری بیٹی شاہین لاہور ہی میں رہ گئیں کہ دونوں کینیرڈ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھیں۔ اب وہ ہوسٹل میں داخل کروا دی گئی تھیں تا کہ ان کے تعلیمی تسلسل میں تعطل اور بے ربطی پیدا نہ ہو۔ کراچی میں قیام کے دوران میں ہی صفیہ اچانک اپنے شوہر اور بچوں کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ دراصل صفیہ وجع المفاصل یعنی جوڑوں کے درد یا گٹھیا کے دیرینہ مرض سے دوچار تھیں جو انھیں اکثر پریشان رکھتا تھا۔ راشد کے شادی کے فوراً بعد کے بعض خطوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صفیہ کو یہ مرض کسی نہ کسی حد تک اسی زمانے سے لاحق تھا جو شہریار کی ولادت کے بعد بڑھ گیا۔ چنانچہ مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں سے ان کا علاج ہوتا رہا۔ امریکا میں قیام کے دوران میں بھی ان کا علاج ہوا مگر اس بیماری نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اگرچہ درد کی شدت کبھی کبھار انھیں تڑپا کر رکھ دیتی تھی لیکن یہ بیماری ایسی بھی نہیں کہ اس سے کوئی شخص اچانک اور آناً فاناً مر جائے۔ ان کی اچانک موت کا سبب ڈاکٹر کی بے احتیاطی تھی۔ ہوا یوں کہ انھوں نے بی کامپلیکس (B Complex) کا ''انٹرامسکولر انجکشن لگوایا۔ بدقسمتی سے انجکشن غلط لگا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ (۳۸) ڈاکٹر آفتاب احمد کے مطابق ''دوا کے ساتھ ہوا کا بلبلہ بھی نس میں چلا گیا اور وہ آن کی آن میں جاں بحق ہو گئیں۔ اتفاق سے عباس صاحب اور میں بھی اس وقت راشد صاحب کے ہاں بیٹھے تھے، راشد صاحب اس ناگہانی صدمے سے سٹ پٹا گئے۔ (۳۹) یہ حادثہ ۱۹/اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ہوا۔ اس وقت راشد اور ان کے اہل خانہ طارق روڈ، پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ مرحومہ کو کراچی ہی میں دفن کر دیا گیا۔

یہ ایک جانی بوجھی سچائی ہے کہ ازدواجی زندگی والدین اور اولاد کے تعلقات پر کسی نہ کسی انداز سے اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اس معاملے میں راشد کو بھی کوئی استثنا حاصل نہیں تھا۔ اگرچہ والدہ سے ان کے اختلافات کی وہ نوعیت نہ تھی جو والد کے ساتھ تھی مگر والدہ سے بھی کبھی کبھی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ خاص طور پر ایسے موقعوں پر جب راشد ان سے بہتر برتاؤ کی توقع رکھتے تھے۔ ۲۸/جنوری ۱۹۴۰ء کو دلی سے والدہ کے نام لکھا ہوا راشد کا ایک خط اس مسئلے کی بڑی عمدگی سے نشاندہی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میں خوش ہوں کہ آپ مجھ پر اتنی خفا نہیں ہیں جتنا کہ میں سمجھتا تھا۔ ابا جان قبلہ کو میں نے ان کے خط کے جواب میں الگ خط لکھ دیا ہے۔ میں اتنی گزارش کروں گا کہ صفیہ سے بھی خوش ہو جایئے۔ وہ ہرگز اس بات کی خواہش مند نہیں ہے کہ آپ اس سے ناراض ہوں۔ بلکہ وہ آپ کی خوشنودی چاہتی ہے۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ میری کسی بہن کو اس کی مدد کے لیے وقتاً فوقتاً میرے پاس بھیجیں یا نہ بھیجیں لیکن دل صاف ہونے چاہئیں۔ آپ ننھی کی پیدائش کے موقع پر نہیں آ سکیں تو مجھے بھی اور صفیہ کو بھی اس کا رنج ہے لیکن آپ کی مجبوریاں پیشِ نظر ہیں۔ ممانی صاحبہ کے آنے سے بہت سہولت ہو گئی...'' (۴۰)

پرانے زمانے میں بلکہ آج کل بھی پسماندہ علاقوں میں یہ عجیب رواج ہے کہ شوہر تو اپنی جائے ملازمت پر رہتا ہے لیکن بیوی کو ساس سسر اکثر اوقات ان کی رضا کے بغیر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ مصلحتیں بھی ہوں گی مگر شادی کے ابتدائی زمانے میں ایسا کرنا ایک ناروا جبر معلوم ہوتا ہے۔ راشد کی شادی ۱۹۳۵ء کے اواخر میں ہوئی اور ۱۹۳۶ء کے اوائل ہی میں انھیں اس جبر کا شکار ہونا پڑا۔ راشد نے

اسے شدّت سے محسوس کیا مگر سمجھوتہ کرلیا۔ ظاہر ہے کہ ان کی بیوی صفیہ بھی اس فیصلے سے خوش نہ تھیں لیکن خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ راشد نے اس زمانے میں انھیں جو خط لکھے، ان میں محبت اور خصوصاً اس کے بدنی اور جنسی پہلو کا بے محابا اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ تسلی دینے کا انداز بھی غالب آ گیا ہے۔ ۲۸ر فروری ۱۹۳۶ء کو ملتان سے لکھتے ہیں:

''صفیہ خدا نے چاہا تو ہم دونوں کو موت کے سوا کوئی چیز جدا نہ کر سکے گی۔ میں اس جدائی کو عارضی سمجھتا ہوں۔ ورنہ میرے لیے یہ ناممکن نہ تھا کہ میں تمام رکاوٹوں کو صرفِ نظر کر کے تمھیں اپنے پاس لے آتا۔ امی اور ابا اگر فی الحال اس میں خوش ہیں کہ 'ہم گرم دودھ کو یکدم نہ پی جائیں' تو ہمیں بھی ان کی رائے کا احترام کرتے ہوئے صبر و اطمینان سے کام لینا چاہیے۔ لیکن میں تمھاری محبت کا اتنا بھوکا ہوں کہ بارہا جی چاہتا ہے کہ ان تمام رکاوٹوں کو لاپروائی سے ٹھکرا دوں۔ پھر ضبط کر لیتا ہوں۔ مگر آہ، صفیہ مجھے تمھارے روح پرور بوسوں کی ہوس ہے۔ میں تمھاری ہم آغوشی کے لیے ترستا ہوں۔ میں تمھاری دلفریب مسکراہٹوں کے لیے بیتاب ہوں۔ تمھارے بغیر میری زندگی میں راحت نہیں، یہ جدائی جس پر ہم مجبور کیے گئے ہیں، جسم و روح کی جدائی سے کم نہیں۔ یہ محض سسکنا ہے۔ خدا کرے یہ جدائی کے طویل لمحات ختم ہوں اور پھر ہم جب تک زندہ ہیں ایک لمحے کے لیے بھی ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہ ہوں۔''(۴۱)

بعد میں راشد کو اپنے والدین کا یہ فیصلہ کھٹکنے لگا اور انھوں نے اس پر کسی قدر ردِعمل کا اظہار بھی کیا اور یوں ایک طویل بدمزگی پیدا ہوئی۔ راشد کے ایک خط سے اس بدمزگی کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے خدشات کا بھی پتا چلتا ہے جو اس ضمن میں انھیں اپنے والد کے رویّے سے تھے۔ یہ خط ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳ء کو نیویارک سے لکھا گیا۔ راشد اس میں اپنے والد سے کہتے ہیں:

''بچوں کے بارے میں مجھے یہاں کے حالات دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ جو کچھ یہاں سال ڈیڑھ دو سال میں سیکھیں گے اپنے ملک میں دس بارہ سال میں بھی نہیں سیکھ سکتے۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں صفیہ کو میرے پاس آنے سے روکا تھا۔ اس سے خاصی طویل بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ صفیہ اور بچوں کو رخصت کر دیجیے۔''(۴۲)

اس ضمن میں راشد نے اپنے بھائی فخر محمد ماجد کے نام بھی ایک روز قبل ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

''...ابا جان اسے آج بھی اسی طرح روک رہے ہیں جیسے انھوں نے ۱۹۳۶ء میں میری شادی کے بعد اسے میرے پاس آنے سے روکا تھا۔ اور ان کا یہ اقدام خاصی طویل بدمزگی کا باعث بنا رہا۔ کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم نہیں ہو سکے گی۔ کبھی یہ کہ صفیہ خود یہاں خوش نہیں رہ سکے گی۔ کبھی ماموں جان کی بیماری کا عذر ہے اور کبھی انھیں یہ خیال آتا ہے کہ اس کے اور بچوں کے چلے آنے سے گویا میں اور سب سے قطع تعلق کر لوں گا۔ تعلیم بلکہ تربیت تو بچوں کو جو یہاں ڈیڑھ دو سال میں حاصل ہو گی، پاکستان میں دس سال میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ صفیہ کے خوش رہنے کا ذریعہ اپنے میاں کی رفاقت سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ پھر وہاں، نہ لاہور میں نہ گوجرانوالے میں قیام کی کوئی موزوں جگہ ہے، جہاں آرام حاصل ہو یا بچے کھیل کود سکیں۔ یہاں اس نئے مکان کے ساتھ بلکہ سامنے اور پچھواڑے گھاس کے میدان ہیں۔ مکان کی صرف دو منزلیں ہیں جس سے زیادہ کوفت نہیں ہو سکتی۔ ماموں جان کی

بیماری میں اب تک ہم لوگ ان کی کیا مدد کر سکے ہیں جواب صفیہ کی موجودگی سے ہو سکے گی۔ شاید اتنے بچوں کے شور وغل سے ان کی صحت کو فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچے۔ اور رہا ابا جان سے قطع تعلق کا مسئلہ، فی الحال تو میرے خواب وخیال سے بھی بعید ہے۔ اگر وہ یونہی میرے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے رہے تو اور بات ہے۔ ان حالات میں آدمی تارک الدنیا ہی بن کر رہ سکتا ہے اور کچھ نہیں۔'' (۴۳)

راشد کی شادی عین عالمِ شباب میں ہوئی۔ وہ اپنی بیوی کی شکل وصورت سے بھی مطمئن تھے اور خدمت گزاری سے بھی۔ علاوہ ازیں، کچھ تو ان کی عمر کا تقاضا تھا اور کچھ یوں بھی انسانی فطرت ہے کہ اس کے باعث 'وصال' کی لذتوں نے انھیں سرشار کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ 'فراق' ان کے لیے کسی بہت بڑی اذیت سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد جب راشد کو ملتان میں تنہا رہنا پڑا تو انھوں نے اس جدائی اور تنہائی کو شدت سے محسوس کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے صفیہ کے نام جو خط لکھے وہ طویل رومان ناموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوں میں جنسی جذبہ بہت غالب دکھائی دیتا ہے جو وصال کی سرشاری کا آئینہ دار ہے۔ اس کا اندازہ محض راشد کے اختیار کردہ اندازِ تخاطب اور اختتامی کلمات ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے صفیہ کو 'میری جان'، 'میری جان صفیہ'، 'صفیہ میری جان'، 'میری صفیہ میری جان'، 'پیاری صفیہ'، 'بہت پیاری صفیہ'، 'میری صفیہ'، 'میری جان فیّو' 'میری جان میری فیّو' 'دل و جان سے پیاری صفیہ' اور 'مجھے جان سے محبوب صفیہ' جیسے الفاظ سے مخاطب کیا ہے اور 'تمھارا راشد'، 'تمھارا اپنا راشد'، 'تمھاری محبت کا دیوانہ راشد'، 'تمھارا پورے تپاک اور محبت کے ساتھ راشد' 'گہرے تپاک اور محبت کے ساتھ تمھارا اپنا راشد'، 'بے حد محبت اور تپاک کے ساتھ تمھارا ہی راشد'، 'محبت اور تپاک کے ساتھ تمھارا دیوانہ راشد'، 'انتہائی محبت اور تپاک کے ساتھ تمھارا دیوانہ راشد'، 'والہانہ محبت اور پیار کے ساتھ تمھارا دیوانہ راشد'، 'انتہائی پیار کی ہوس کے ساتھ تمھارا دیوانہ راشد'، 'جلد ملنے کی شدید تمنا کے ساتھ تمھارا دیوانہ راشد'، 'میں ہوں تمھارا، دل و جان سے تمھارا راشد' اور 'تمھارا اپنا اور تمھاری محبت کی آگ میں جلنے والا راشد' جیسے اختتامی کلمات تحریر کیے ہیں۔ 'میری جان' کا تخاطب تو راشد کی بعض ابتدائی نظموں میں بھی 'صفیہ' کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ نسرین انجم بھٹی کو دیے گئے تحریری مصاحبے میں راشد خود بیان کرتے ہیں:

''میری نظموں میں کئی اصلی اور فرضی عورتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں لیکن ان سب پر جو عورت حاوی ہے اور جس کی طرف ہمیشہ 'میری جان' کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے، وہ بیوی ہے۔ خاص طور پر 'اتفاقات' 'شاعر درماندہ' 'سپاہی' 'بے کراں رات کے سناٹے میں' اور 'دریچے کے قریب' میں۔ ان میں بیوی کا کردار تو نہیں ابھرتا لیکن اس کی موجودگی کی گرمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔'' (۴۴)

بلکہ راشد کے دوست جسٹس عطاء اللہ سجاد کے بقول:

''اسی سے پیار مجھے ہے اسی سے پیار مجھے'' والی نظم بھی صفیہ کے لیے ہی کہی گئی تھی، جب وہ راشد کی منگیتر تھیں۔'' (۴۵)

راشد شادی کے ابتدائی برسوں میں عالمِ سرشاری میں رہے۔ تین چار سال کے بعد شادی کی سرشاری میں فطری طور پر کمی آ گئی۔ اس کے کچھ خارجی اسباب بھی تھے جن میں نمایاں ترین سبب یہ تھا کہ راشد شادی کے معمول کو اپنے عزائم میں مزاحم تصوّر کرنے لگے تھے۔ خاص طور سے ان کی شادی ان کے خاکسار تحریک میں شامل ہو کر اسلام کی خدمت کرنے کے عزم میں حائل ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس مسئلے پر تو انھوں

نے بالآخر قابو پالیا تھا، تاہم شادی کے باعث پیدا ہونے والی پابندیاں انھیں کھٹکنے لگی تھیں۔ چنانچہ ۲۸ر فروری ۱۹۳۹ء کو ملتان سے آغا عبدالحمید کے نام لکھے گئے خط میں راشد کا انداز بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے:

''تم نے اپنی متوقع شادی کے متعلق مجھے کچھ لکھا تھا۔ مجھے شادی کا قریباً تین سال کا تجربہ ہو چکا ہے۔ شادی برے آدمیوں کے لیے یقیناً اچھی چیز ہے لیکن اچھے آدمیوں کے لیے قطعاً اچھی نہیں۔ اور میں تمھیں اور اپنے آپ کو کسی قدر اچھے آدمیوں میں تصوّر کرتا ہوں۔ محض جنسی خواہشات کا اظہار تو کئی طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ بالخصوص لاہور میں۔ شادی کے ابتدائی دن یقیناً خوشگوار ہوتے ہیں لیکن بعد کی Routine توبہ۔ میں اپنے معاملے میں شادی اور کلر کی کو چکی کے دو پاٹ سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ ''بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔''(۴۶)

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ راشد اور صفیہ کی ازدواجی زندگی میں کسی طرح کی خرابی یا سرد مہری پیدا ہوگئی تھی۔ ان کا تعلق خاطر ہمیشہ قائم رہا۔ صفیہ میں بہت سی خوبیاں تھیں، جن کے، راشد ان کی وفات کے بعد بھی معترف رہے۔ ''مرحومہ ایثار اور سگھڑپن کا نمونہ تھیں اور ایسی صابر و شاکر کہ ان کی موجودگی نے راشد صاحب کو گھر گرہستی کے تمام افکار سے نچنت کر دیا تھا۔ بچوں کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری انھی کے سر تھی، اس لیے بچوں کو ہمیشہ اپنی ماں سے قربت کا احساس زیادہ رہا۔''(۴۷) اس اعتبار سے راشد صفیہ سے خوش تھے اور ان کے لیے ہمیشہ اپنے دل میں جگہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد بھی راشد ان کا ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے اور یہ بات انھیں ہرگز پسند نہ تھی کہ کوئی اور بھی ان کا ذکر برائی سے کرے۔ ایک بار فخر محمد ماجد نے ان پر کوئی اعتراض کیا تو راشد نے انھیں سمجھاتے ہوئے ۱۰ر جون ۱۹۶۳ء کو نیویارک سے مرقومہ خط میں لکھا:

''....معلوم نہیں تمھارے دل میں یہ بات کیسے بیٹھ گئی ہے کہ وہ تمھاری مخالف تھی۔ میں کسی طرح رورعایت سے کام نہیں لے رہا۔ لیکن اس نے تمھارے بارے میں ہمیشہ نیک اندیشی اور خیر خواہی کا اظہار کیا۔ اگر کبھی نکتہ چینی کی تو تمھارے منہ پر کی۔ اور عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے شاید اسے اتنا حق ضرور پہنچتا تھا۔ معمولی لڑائی جھگڑے کہاں نہیں ہوتے لیکن اس نے دریدہ دہنی یا دشنام طرازی سے کبھی کام نہ لیا۔ تمھیں اتنی بات خود بھی معلوم ہوگی۔ تمھاری بہتری کے لیے جو کچھ مجھ سے ہوا، اس میں بھی اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اگر وہ ہامی نہ بھرتی یا اسے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی تمنا ہوتی تو وہ میرے راستے میں خاصی مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ اس کی موت کے بعد تم اس پر بداعتمادی کا اظہار کر رہے ہو، اس نے اپنی زندگی میں بھی تم پر کسی بداعتمادی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھے تمھارے ان خیالات سے دلی رنج پہنچا ہے۔ خدا تمھیں معاف کر دے۔''(۴۸)

اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صفیہ، راشد اور ان کے بھائی بہنوں کے تعلق خاطر میں حائل نہیں ہوتی تھیں۔ یہ سب باتیں راشد کے دل میں ان کی قدر و منزلت قائم رکھتی تھیں۔ راشد جیسے بڑے آدمی کی مجلسی ضرورتوں کو پورا کرنا تو صفیہ کے لیے مشکل تھا تاہم ان کے دوستوں کی خاطر تواضع کرنے اور ضیافتوں کا اہتمام کرنے میں انھوں نے ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا۔ یوں صفیہ کی موجودگی راشد کے لیے بہت سے معاملات میں بےفکری کا باعث تھی۔ اور اس اعتبار سے ان کی ازدواجی زندگی خاصی کامیاب تھی۔ راشد بطور شوہر ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے تھے لیکن وہ محض گھریلو زندگی پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کی زندگی کے علمی، ادبی اور سماجی پہلو بھی تھے جنھیں فراموش کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔

مکاتیب

(۱)

کمشنرز آفس۔ ملتان۔

جون ۱، ۱۹۳۷ء

میری جان صفیّہ،

کئی دنوں سے تمھاری طرف سے کوئی خط نہیں آیا۔ نہ میرے خط ہی کا تم نے کوئی جواب دیا۔ بے حد حیرت ہے۔ تم کیا جانو کہ تمھارا خط نہ ملنے سے میں کس قدر پریشان ہو جاتا ہوں۔ بالخصوص ان دنوں تو میں چاہتا ہوں کہ ہر لحہ تمھاری خبر موصول ہوتی رہے۔ (۴۹) یہ تو ممکن نہیں، لیکن ہر دوسرے تیسرے دن تمھارا خط آنا نہایت ضروری ہے۔ اگر نہیں لکھو گی تو ایک طرف اپنے سب سے بڑے فرض میں کوتاہی کرو گی، دوسرے میرے دل کو رنج پہنچاؤ گی۔ کیا اب میں ہی تمھارے لیے سب کچھ نہیں؟ اگر مجھی کو تم اتنے دن دل سے بھُلا کے رکھو تو بے حد افسوس ہے۔ میری یہ حالت ہے کہ ایک لحہ بھی تمھاری یاد کے بغیر نہیں گزرتا۔ تمھیں ملنے کی آرزوئیں شب و روز بے قرار رکھتی ہیں۔

میں نے تو لکھا تھا کہ تم ۱۵۔ جون سے پیشتر یہاں میرے پاس، میری آغوش میں پہنچ جاؤ۔ لیکن میرا وہ خط ابھی ماموں جان قبلہ (۵۰) کو نہیں ملا ہوگا کہ انھوں نے تحریر فرما دیا کہ صفیہ کو جون کے آخر تک رہنے دیا جائے۔ ابّا جان قبلہ (۵۱) سے تو میں اصرار کر سکتا ہوں، لیکن ماموں جان سے نہیں۔ ان کا حسنِ سلوک دیکھ کر جی نہیں چاہتا کہ ان کا دل توڑوں لیکن بہتر ہو کہ اپنی امّی جان (۵۲) کو کہہ دو کہ میں ۱۵۔ جون کو ملتان جانا چاہتی ہوں۔ بشرطیکہ تم واقعی آنا چاہتی ہو اور محمود (۵۳) کو ساتھ لے کر یہاں پہنچ جاؤ۔ وہ ایک دو دن کی رخصتیں لے لے گا۔ میرا دل اب اتنا بے قرار ہو رہا ہے کہ میں بمشکل گوارا کر سکتا ہوں کہ تم سے اتنے دن اور جدا رہوں۔ آج سے ہمارے دفتر کے وقت بدل گئے ہیں۔ یعنی ۷ بجے صبح جا کر ایک بجے آیا جاتا ہے۔ پہلے تو دفتر میں دن کا اہم حصّہ جیسا برا بھلا ہوتا مصروفیت میں گزر جاتا تھا۔ اب آج ہی ایک بجے واپس آ کر اداسی اور تنہائی کی ہزار درجہ زیادہ شدّت محسوس کر رہا ہوں۔ اب تو معلوم نہیں یہ پہاڑ سے دن کیسے گزارا کریں گے۔ اگر تم ہوتو یہ دو پہریں کس مزے سے کٹیں۔ پلنگ پر ایک ساتھ ایک دوسرے کی آغوش میں۔ بے پناہ پیار کرتے ہوئے جیسے ہم کیا کرتے ہیں۔ بے شک ہمیں ''وہ چیز'' تو اب نہیں ملنے کی، ہے نا، سمجھتی ہو نا کیا چیز؟ اچھا بے شک نہ سہی، ہم بھی ایسے کیا ''بھوکے'' ہیں! لیکن تم جانو، پیار کی ہوس اتنی بے پناہ ہے کہ کیا کہیے۔ میری جان کوئی لحہ کم گزرتا ہے جب اس تصوّر میں گم نہیں ہوتا کہ تم میری آغوش میں ہو اور میں تمھیں پیار کر رہا ہوں۔ خدا کرے مجھے فی الواقع جلد یہ نعمت پھر نصیب ہو۔ تمھیں ملنے کی اتنی شدید آرزو پہلے بھی نہ تھی۔ یہ ایسا درد ہے جو ہر روز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میری صفیّہ، جانِ راشد، کیا تم بھی میرے لیے میری طرح بے قرار ہو؟ شاید نہیں، ورنہ تم سخت مصروف اور خدانہ کرے سخت تکلیف میں بھی مبتلا ہوتیں تو خط ضرور لکھتیں۔ اب تمھاری توجہ بٹنے لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم اب اُسی کی دلدادہ ہو جاؤ گی جس کو تم لیے پھرتی ہو۔ (۵۴) مجھے یہ احساس بھی بسا اوقات شدید عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن پھر سوچتا ہوں کہ ''اپنا کیا آگے آئے'' والی مثل ہے۔ اچھا جو خدا کو منظور ہے۔ تم مجھے کبھی اُس بے پناہ آرزو سے مایوس نہیں دیکھو گی جو تمھاری محبت نے میرے دل میں شمع نور کے مانند روشن کی ہے۔ میری جان، میری فیّو (۵۵) میری پیاری فیّو، مجھے جلد خط لکھو اور بتاؤ کہ کب آ رہی ہو، کب میرے دل کی تاریکیوں کو روشن کر رہی ہو۔ تو بہ اتنا فاصلہ! دو سو میل! مجھ میں اور تم میں اتنا فاصلہ! جو اپنے درمیان انچ کے سوویں حصے کے برابر بھی تفاوت نہیں رکھنا چاہتے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تمھارے جسم و روح سے اتنی

بھی علیٰحدگی گوارا نہیں کرتا۔ جو مثلاً جسم اور لباس میں ہے۔ میں تمھارا ہی ایک جزو ہونا چاہتا ہوں اور تمھیں اپنا ہی ایک جزو بنانا چاہتا ہوں۔ میری جان، تم تو مجھے اتنا پیار کیا کرتی تھیں۔ اور اب مجھ سے اتنے فاصلے پر بیٹھی جدائی کی اذیتیں گوارا کر رہی ہو۔ میں زیادہ محرومی برداشت نہیں کر سکتا۔ سب کو سلام۔ میں ان دنوں بالکل خیریت سے ہوں۔

تمھارا اپنا

اور تمھاری محبت کی آگ میں جلنے والا

راشد

(۲)

Radio Division

United Nations,

New York.

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء

صفیہ، میری جان! میں ۱۹۔ اکتوبر کی صبح کو بخیر و عافیت یہاں پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سفر بغیر کسی دشواری کے طے ہوا۔ میں نے کراچی اور لندن سے تمھیں اپنے وہاں پہنچنے کے بارے میں تار دے دیے تھے۔ پھر نیویارک پہنچ کر بھی ایک تار دیا تھا۔ اور کل ایک خط بھی لکھا۔ لیکن وہ خط غالباً ایک مہینے کے بعد تمھیں ملے گا۔ کیونکہ اس پر پوری ٹکٹیں نہ لگ سکیں۔

میں نے آج صبح سے یہاں اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ خدا مجھے اس میں کامیابی دے۔ آج رات سے میں خود خبریں براڈ کاسٹ کیا کروں گا۔ یہ پروگرام پاکستان میں 16 اور 19 میٹر پر BBC کے توسّط سے، دوپہر کے سوا دو بجے سے ڈھائی بجے تک سنا جا سکے گا۔ (۵۶)

مجھے رہنے کے لئے یہاں ٹیوڈر ہوٹل (Tudor Hotel) میں ایک مختصر سا کمرہ ملا ہے۔ کمرے کے ساتھ مختصر تر غسل خانہ بھی ہے۔ لیکن کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں چلنے پھرنے کی گنجائش کم ہے۔ اس ہوٹل کی بیس منزلیں ہیں۔ میرا کمرہ پندرھویں منزل پر ہے۔ یہ ہوٹل دفتر سے کوئی بیس قدم پر واقع ہے۔

کل رات شور کے باعث نیند کم آئی۔ گاڑیوں کا اتنا شور میں نے کہیں نہیں سنا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے شور، موج در موج اٹھ رہا ہو، جیسے متواتر کوئی طوفان چل رہا ہو!۔

آج صبح یہاں اس موسم کی پہلی برفباری ہوئی لیکن برف زمین پر ٹھہری نہیں۔ سب کا کہنا ہے کہ اس دفعہ برف غیر معمولی طور پر جلد آئی ہے۔

یہ شہر تگ و دو کا شہر ہے۔ لوگ سڑکوں پر گاڑی میں ہوں یا پیدل بے پناہ طور پر بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس جلدی کا راز یہ ہے کہ یہاں وقت کو ڈالروں میں تولا جاتا ہے۔ جتنا وقت بچے اتنے ڈالر بڑھتے چلے جاتے ہیں!

آتے ہوئے، راولپنڈی میں ریڈیو کے بعض حضرات کے علاوہ امّی جان (۵۷)، خالہ زینب (۵۸)، عزیزہ مختار (۵۹)، محی الدین (۶۰) اور ان کا ننھا (۶۱) اور عذرا (۶۲) ملنے آئے ہوئے تھے۔ لاہور میں بھی اسی طرح چند دوستوں کے علاوہ ممانی جان (۶۳)

گوجرانوالے سے آئی ہوئی تھیں۔انھوں نے بڑی زحمت اٹھائی۔ان کے ساتھ خالہ بیگم (۶۴) اور ''ڈوڈی صاحب'' (۶۵) تھے۔کراچی میں ہوائی اڈّے پر امین اور ان کی بیگم (۶۶) ملنے آئے اور اپنے گھر لے گئے۔ وہیں رات قیام کیا۔ دوسرے دن صبح، عباس (۶۷) اور مختار صدیقی (۶۸) وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔لندن میں اعجاز (۶۹) اور ایک دوست چوہان صاحب (۷۰) جو بی۔بی۔سی میں کام کرتے ہیں، ملنے آئے۔نیویارک میں کوئی دوست تو نہیں، البتہ اقوام متحدہ کے دفتر کا ایک آدمی آیا ہوا تھا۔اور اقوام متحدہ کی گاڑی مجھے لینے آئی تھی جس میں بیٹھ کر کوئی پینتیس منٹ میں اپنے ہوٹل پہنچے۔

اس سفر کے تجربے سے پتا چلا کہ انگریزی جانے بغیر نیویارک تک پہنچنا ناممکن تو نہیں، لیکن مشکل ضرور ہے۔جگہ جگہ کئی طرح کے کاغذات پُر کرنے ہوتے ہیں۔انگریزی میں ہدایات ملتی ہیں۔ان پر عمل کرنا ہوتا ہے۔اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے انگریزی ہی میں آدمی سوال کرسکتا ہے اور انگریزی ہی میں جواب ملتا ہے۔مارچ میں جب تم بچوں کے ساتھ آؤ تو یہ ضروری ہے کہ کسی ایسے آدمی کا ساتھ ہو جو ہر طرح سے ترجمانی اور رہنمائی کرسکے۔میں نے آتے ہی مکان کے لیے درخواست دے دی ہے۔امید ہے مارچ تک کوئی موزوں جگہ ضرور مل جائے گی۔

بٹّو (۷۱) کا کیا حال ہے۔میرا خط ملنے تک یقیناً تندرست ہو چکا ہوگا۔اسے اداس نہ ہونے دینا۔۔۔ اسے کہنا کہ وہ دل لگا کر پڑھے اور تمھارا ہر وہ کہنا مانے، جس میں اس کی بھلائی ہوتا کہ میں اسے اپنے پاس نیویارک بلوا سکوں۔ایسی کوئی بات اس سے مت کہو جو اسے ڈرپوک بنادے۔ابھی ابھی ابّا جان کا تار مل گیا ہے کہ بٹّو تندرست ہے۔الحمدللہ۔

تمھارا اب کیا حال ہے؟ خدا کرے تمھارے دردوں کو جلد آرام ملے۔اگر کوئی اور دوائی نہ ہو تو آٹو نان ہی باقاعدگی سے استعمال کرتی رہو۔اس سے خاصا افاقہ ہونے لگا تھا۔ممکن ہے اس سے آہستہ آہستہ صحت کامل ہو جائے۔خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے جتنی رقم میں ڈالروں میں منتقل کرا سکا کرالی۔باقی کوئی ڈیڑھ سو کی رقم بچی تھی۔وہ تمھیں منی آرڈر کردی تھی۔امید ہے پہنچ گئی ہوگی۔خط میں اس کی تصدیق کردینا۔

ننّھیاں (۷۲) کیسی ہیں۔نسرین، یاسمین اور شاہین میری پیاری بیٹیاں، بہت یاد آرہی ہیں۔سب سے پوچھ کر بتاؤ میں ان کے لیے یہاں سے کیا بھیجوں۔جب بھی کوئی آنے والا ہوا، اس کے ساتھ یہ چیزیں بھجوادوں گا۔

مہینے کے شروع میں میں کچھ رقم تمھارے نام بنک کے ذریعے منتقل کردوں گا۔غالباً پانچ سو (۷۳) روپے یا زیادہ۔جتنی رقم ہر مہینے بچا سکا ضرور تمھیں بھجواتا رہوں گا۔

تمھاری تصویریں ساتھ لے آیا تھا۔اسے آج صبح سے کئی بار دیکھ چکا ہوں۔میرے سامنے میز پر پڑی ہے۔اللہ کرے کہ میرا یہ سفر جس میں تم سے جدائی سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہے، کم از کم ہمارے بچوں کے مستقبل کی خاطر نیک ثابت ہو۔

ابّا جان ہیں تو انھیں میرا سلام کہہ دینا۔اقبال صاحب (۷۴) کو میری طرف سے السلام علیکم پہنچادو۔

میں تمھیں جلد از جلد اس سے بھی زیادہ مفصل خط لکھوں گا۔

تمھارا راشد

(۳)

Radio Division,

United Nations,

New york, U.S.A.

۲۱۔اکتوبر۱۹۵۲ء

میری جان۔اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے ابھی مجھے خط نہیں لکھا ہوگا۔ بلکہ تم ارادہ کر رہی ہوگی۔کاغذ نہیں ملتا ہوگا۔دوات میں سیاہی نہیں ہوگی۔قلم ننھیاں سکول لے گئی ہوں گی۔وغیرہ وغیرہ۔یا لکھا ہوگا تو اسے یہاں پہنچنے میں کم از کم ایک ہفتہ لگے گا۔تاہم میں تمھیں آج پھر یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

آج کچھ اپنے دفتر کے بارے میں۔یونائٹڈ نیشنز کا دفتر ہوٹل سے صرف سو دو قدم کے فاصلے پر ہے۔ایک بہت بڑی عمارت یوں کھڑی ہے جیسے کسی نے بڑی سی اینٹ اٹھا کر آڑی رکھ دی ہو۔چاروں طرف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ہلکے سبز رنگ کے۔پاس سے تو ان کا کوئی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔لیکن دور سے، زمین پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہلکے فیروزی رنگ کی جھلک پڑتی ہے۔اس عمارت کی سینتیس 37 منزلیں ہیں۔ہمارا دفتر آٹھویں منزل پر ہے۔اور میرے کمرے کا نمبر 814 ہے۔اندر سے بے حد خوبصورت عمارت ہے۔بھول بھلیاں ہیں۔جن میں پہلے ایک آدھ دن راستہ تلاش کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ہر منزل پر لفٹ کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔سطح زمین سے نیچے بھی ایک منزل ہے۔جس پر لوہے کی سیڑھیوں سے اترتے چڑھتے ہیں۔سیڑھی پر قدم رکھ کر کھڑے ہو جائیں، سیڑھیاں بجلی سے چل رہی ہیں۔خود بخود نیچے لے جائیں گی۔یا اوپر آنا ہو تو اوپر لے آئیں گی۔اس عمارت کے اندر کوئی چار ہزار کے قریب مرد عورتیں کام کرتی ہیں۔لفٹوں کی نگران بالعموم لڑکیاں ہیں۔حبشی لڑکیاں۔امریکہ کی حبشنیں۔چھوٹے چھوٹے قد کی، گھنگھریالے بالوں والی، سیاہ رنگ۔خدوخال کسی حد تک مدراسیوں سے ملتے جلتے۔موٹے موٹے ہونٹ، امریکی لہجے میں انگریزی فرفر بولتی ہیں۔ہمارے دفتر میں یعنی بحرالکاہل کے ماورا ملکوں کے پروگرام کے سیکشن میں جی۔ایل او بھرائے انچارج ہیں۔یہ پہلے آل انڈیا ریڈیو میں تھے۔میرے فوج میں جانے کے بعد پروگرام اگزکٹو ہو کر آئے تھے، دہلی میں۔بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔شہر سے دور مکان لے رکھا ہے۔اپنی کار پر روز آتے جاتے ہیں۔اپنے ساتھ اپنے خرچ پر اپنا ملازم بھی لائے ہوئے ہیں۔انھوں نے ہفتہ کی شام کو مجھے گھر پر کھانے پر بلایا ہے۔کہتے ہیں دیسی کھانا کھلاؤں گا۔پشاور کے رہنے والے ہیں۔لیکن اب تو ''شرنارتھی'' ہو کر ''بھارتی'' ہو چکے ہیں۔ان کے علاوہ ایک اور ہندوستانی ورما ہیں، جو ہندی میں خبریں ترجمہ کرتے اور پڑھتے ہیں۔وہ اقوام متحدہ کے ملازم نہیں۔جتنے پروگرام کریں اتنے پیسے وصول کر لیتے ہیں۔خالی وقت میں کولمبیا یونیورسٹی میں ہندی پڑھاتے ہیں۔یہ یونیورسٹی، ہوٹل سے کوئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔اردو بھی اس میں پڑھائی جاتی ہے۔سنا ہے کوئی یو۔پی کی خاتون اردو پڑھا رہی ہیں۔پھر چار چینی ہمارے ساتھ ہیں۔مسٹر پنگ (PENG) جو چین کے کسی ریڈیو سٹیشن کے انچارج رہ چکے ہیں۔مسز چیانگ دو بچوں کی ماں ہیں۔ایک بائیس برس کا لڑکا ہے اور ایک بیس برس کی لڑکی۔میاں بھی امریکا میں رہتے ہیں۔واشنگٹن میں کوئی کام کرتے ہیں۔مس لی نوجوان خاتون ہیں۔چینی میں خبریں ترجمہ کرتی ہیں۔ایک اور چینی خاتون ہیں، جن کا نام یاد نہیں رہا۔ایک برمن خاتون مس متانی (Matani) ہیں، جو پہلے دن ہی مجھے یونائٹڈ نیشنز کی عمارت میں اوپر سے نیچے تک خوب سیر کرا لائیں۔ ہر چیز دکھائی ہر چیز سمجھائی۔یہ برمی زبان کے پروگرام کی نگران

ہیں۔ کچھ امریکن خواتین ہیں۔ ایک مس میرین مرز (Marian Merz) ہیں جو ہمارے سیکشن کی سکرٹری ہیں۔ فائلیں رکھتی ہیں، ٹائپ کرتی ہیں۔ ایک مسز فلس ہیبر (Phillis Heber) ہیں۔ نوجوان خاتون ہیں اور حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ ان کے میاں بھی کسی ریڈیو سٹیشن پر انتظامی شعبے میں کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کے کتنے بچے ہیں؟ کہنے لگیں آئندہ فروری میں پہلے بچے کی منتظر ہوں۔ بار بار کہتی رہیں کہ تم اپنے بیوی بچوں کو نیویارک لے آؤ۔ یہ مسٹر پنگ کی سکرٹری ہیں۔ یہ سب لوگ راحت (۷۵)، بخاری (۷۶) اور آغا اشرف (۷۷) کو خوب جانتے اور ان کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں تم پاکستانی بہت ہی اچھے لوگ ہو۔ مجھے بھی راحت، بخاری اور اشرف کی قائم کی ہوئی شہرت کو برقرار رکھنا ہوگا۔ یہ لوگ میٹھی میٹھی باتوں کے رسیا ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے سخت سے سخت زحمت برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں یونائٹڈ نیشنز کے دفتر کے کمروں میں تیز تیز دوڑتی بھاگتی دکھائی دیتی ہیں، جیسے ان کے بغیر اس دفتر کے چلنے کی امید نہ ہو۔ بے حد ہوشیار اور مستعد ہیں۔ عمارت میں ہر جگہ صفائی ہے۔ کوئی سگرٹ یا دیا سلائی کا ٹکڑا یا کاغذ پھینکتا دکھائی نہیں دیتا۔ تھوکنا تو ایک طرف رہا، جو ہمارے ملک کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ غسل خانے اتنے صاف ہیں کہ ان میں پیشاب تک کرنا گوارا نہ ہو! یہاں ایک سال بھر سے سب لوگوں کو میرا انتظار تھا۔ بعض کو تو محض اس لیے کہ جس کمرے میں مجھے کام کرنا تھا، اس پر ان کی نظر تھی۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے بعض کمروں میں دو دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ چاہتے تھے کہ کم از کم یہ کمرہ مل جائے اور ذرا آسائش سے بیٹھ سکیں۔ لیکن دفتر والوں نے یہ کمرہ میرے لیے سال بھر سے خالی رکھا ہوا تھا، کیونکہ اگر ایک دفعہ کوئی کمرے میں گھس جائے تو اسے نکالنا مشکل ہے۔ میرے ذمے روزانہ خبروں کا ترجمہ ہے۔ فی الحال۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ دوپہر کو کھانا کھا کر دفتر جاتا ہوں۔ اور رات کو ساڑے نو بجے پروگرام کر کے ہوٹل واپس آ جاتا ہوں۔ کھانا اقوام متحدہ کے کافی ٹیریا ہی میں کھاتا ہوں۔ کیونکہ اکثر ہوٹل نو بجے کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔ کافی ٹیریا وہ جگہ ہوتی ہے جہاں چیزیں پڑی ہیں اور ہر شخص اپنی مرضی سے اٹھا کر ایک طشتری میں رکھ لیتا ہے۔ پھر خزانچی کے پاس طشتری اٹھا کر لے جاتا ہے۔ وہ حساب لگا کر پیسے وصول کر لیتی ہے۔ اور پھر کسی خالی میز پر بیٹھ کر آدمی کھانا کھاتا ہے۔ ہوٹلوں کے کھانے سے کسی قدر سستا اور بہتر ہے۔ بازار میں ایسے کھانے پر کم از کم دو ڈھائی ڈالر خرچ ہوں۔ کافی ٹیریا میں کوئی ایک ڈالر میں پیٹ بھر جاتا ہے۔ میں نے آج صبح بازار جا کر کچھ خرید و فروخت کی۔ کچھ یونہی سڑکوں پر پھرتا رہا تا کہ دیکھوں کہاں کہاں کس کس چیز کی دکان ہے۔ ایک اچھا سا اوورکوٹ خریدا۔ کچھ رات کو پہننے کے پاجامے قمیصیں وغیرہ۔ خود دو تین ڈبوں میں چیزیں بندھوا کر دو تین میل چل کر ہوٹل پہنچا۔ یہاں سب لوگ اپنا کام آپ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی الجھن ہوتی ہے کہ دفتر میں کوئی چپراسی نہیں۔ چپراسی کو بلانے کی گھنٹی تک نہیں۔ پانی کا گھونٹ تک پینا ہو تو خود نل تک جانا پڑتا ہے۔ ہر منزل پر دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ٹونٹیاں لگی ہیں۔ جن کا پانی بہ کر زمین پر نہیں گرتا۔ بلکہ ''واش بیسن'' کی طرح اندر ہی غائب ہو جاتا ہے۔ خط ڈالنا ہو تو کسی منزل پر خود لفٹ کے ذریعے جائیں وہاں اقوام متحدہ کے دفتر کا ڈاک خانہ ہے۔ تنخواہ وصول کرنی ہو تو کسی اور منزل پر جانا ہوگا۔ ڈاکٹر سے ملنا ہو تو مکان کا کوئی اور طبقہ تلاش کیجیے وغیرہ وغیرہ۔ آج کل یہاں جنرل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ایک بے حد خوبصورت ہال میں دنیا کی ساٹھ قوموں کے نمائندے جمع ہیں۔ ہم ان کی تقریریں وہاں جا کر بھی اور اپنے اپنے کمروں میں بھی لاؤڈ سپیکر پر سن سکتے ہیں۔ جس زبان میں چاہیں سن سکتے ہیں۔ اصل مقرر کی زبان سے بھی اور ترجمانوں کی زبان سے بھی۔ جو زبان لگانی ہو بٹن دبا کر لگا لیجیے اسی میں پروگرام ملتا رہے گا۔ دفتر میں بہت سے لوگ دوست بن گئے ہیں۔ آج ریڈیو ڈویژن کے ڈائرکٹر مسٹر پیٹر ایلین سے بھی ملاقات ہوئی۔ اپنے پروگرام کے بارے میں مختلف تفصیلات زیر بحث رہیں۔ بے حد ذہین اور طبّاع آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بخاری صاحب سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ جنرل اسمبلی

کی وجہ سے بے حد مصروف ہیں۔لیکن انھوں نے دعوت دے کر ۲۷۔اکتوبر کو اپنے ہاں بلوایا ہے۔شاید اس سے پہلے ہی ان کے ساتھ ملاقات ہو جائے۔راحت چھتاری تو کینیڈا چلے گئے ہیں۔ان کی وجہ سے یہاں آنے میں بڑی کشش تھی۔لیکن وہ کشش نہ رہی۔

میں خط یہیں ختم کر رہا ہوں۔اگر اور لکھا تو لفافہ بھاری ہو جانے کا اندیشہ ہے۔پرسوں پھر بہت سی باتیں ہوں گی۔ننّھیوں اور میرے پیارے بٹّو کو بہت بہت پیار۔ابّا جان کو سلام۔اقبال صاحب کو میرا اسلام کہہ دینا۔

تمھارا راشد

(۴)

نیویارک

۲۴۔اکتوبر ۱۹۵۲ء

میری جان،اس سے پہلے دو خط لکھ چکا ہوں۔ابّا جان نے ۲۰۔اکتوبر کو پشاور سے ایک خط ڈاک میں ڈالا اور وہ مجھے صرف چار دن کے اندر اندر،یعنی آج صبح مل گیا۔اگر تم نے بھی اب تک کوئی خط لکھا ہوتا تو ضرور مل جاتا۔لیکن میں ابھی تک منتظر ہوں۔

ابّا جان نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ بٹّو ۱۶ اور ۱۷۔اکتوبر کو بہت بے قرار رہا۔لیکن ۲۰۔اکتوبر تک چلنے پھرنے ہی نہیں بلکہ دوڑنے بھاگنے اور اچھلنے کودنے بھی لگا۔خدا کا شکر ہے کہ وہ اب تندرست ہو گیا ہے۔مجھے امّید ہے کہ وہ اب سکول جانے لگا ہوگا۔

میں نے پرسوں سب بچوں کے لئے تصویری کارڈ بھیجے ہیں۔امّید ہے کہ وہ انھیں اس خط سے پہلے مل چکے ہوں گے۔تم اور ننّھیاں اور بلّو (۷۸) سب یاد آتے ہو۔بہت یاد آتے ہو۔ابّا جان نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جس دن میں پشاور سے روانہ ہوا،ارشاد (۷۹) اپنی کوٹھڑی میں دروازے بند کر کے روتا رہا۔یہ پڑھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔اسے یہاں منگوانے پر خرچ بہت آئے گا،ورنہ اسے منگوانے کی کوشش کرتا۔بعض لوگوں نے،جن میں راحت چھتاری بھی تھے،اور جن میں میرے ایک شریک کار مسٹر اوبھرائے بھی ہیں،اپنے نوکر منگوا رکھے ہیں۔لیکن یہ سب پیسے کا کھیل ہے۔سمندر کے راستے سے بھی اس کے آنے پر کوئی ڈیڑھ ہزار روپیہ خرچ ہو جائے گا۔

مانٹریال سے فخری (۸۰) کا خط آیا ہے۔لکھتا ہے کہ بہت پڑھنا پڑتا ہے۔اور دن رات محنت کرنی پڑتی ہے۔

مجھے یہاں سب کچھ کٹ کٹا کر کوئی دو ہزار روپے ماہانہ ملیں گے۔پنشن،انشورنس،ڈاکٹری امداد وغیرہ ایسی مدّیں ہیں جن کے لیے عملے کے ہر آدمی کو رقم کٹوانی پڑتی ہے۔اور میرے خیال میں یہ مفید بھی ہے۔یہ پیسے کا مفید استعمال ہے۔میں انشاءاللہ نومبر کے شروع میں تمھیں آدھے مہینے کی تنخواہ میں سے کوئی پانچ سو روپے کی رقم یا زیادہ تمھیں بھجواؤں گا۔تم اس پیسے میں جتنا بھی جمع کر سکو گی اتنا ہی اچھا ہوگا۔بچوں کو دعائیں۔

تمھارا راشد

(۵)

Radio Division,

United Nations,

New York (USA)

نیویارک

۳۔نومبر۱۹۵۲ء

میری جان۔تمھارے خط کے لیے بے حد اداس ہو گیا تھا۔لیکن تمھارے اس پہلے خط نے اور بھی اداس کر دیا۔تمھاری بیماری اور بلّو کی بیماری کی خبر پڑھ کر دل کو دیر تک تکلیف رہی۔بہتر ہو کہ تم ڈاکٹر عبدالمجید صاحب سے جا کر ملو۔اور اُن سے کہو کہ وہ توجّہ سے علاج کریں۔ وہ صوبے کی لیبارٹری میں کام کرتے ہیں۔اور وہی ہیں جن کے پاس میں تمھیں پہلے پہل لے گیا تھا۔اگر خرچ زیادہ آئے تو مجھے ڈاکٹر صاحب کے دستخطوں کے ساتھ رسید بھجوا دو، یہاں سے اقوام متحدہ والے اس کے تمام پیسے دے دیں گے۔ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کا خرچ، ہر ایک چیز۔تمھارا بھی اور بچوں کا بھی۔رسید پر ڈاکٹر کے دستخط اور مہر ضرور ہونی چاہیے۔

یہاں آ کر میرا دوبارہ ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمھارے دانتوں کی حالت بہت خراب ہے۔گھِس گئے ہیں۔اور جلدی سے کسی ماہر دندان ساز سے مشورہ کرو۔اس کے علاوہ پہلے دن بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) زیادہ نکلا اور ڈاکٹر نے کہا سگریٹ پینا چھوڑ دو اور چوبیس گھنٹے کے آرام کے بعد پھر ہمارے پاس آؤ۔دوسرے دن خون کا دباؤ نارمل نکلا۔اور ڈاکٹر نے مجھے سب سے اونچے درجے میں رکھ دیا۔جن کا ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے، ان کے چار درجے مقرر ہیں۔جن کی صحت سب سے اچھی ہو انھیں A کلاس میں رکھا جاتا ہے۔اللہ کا شکر ہے۔دل پر جو بوجھ سا محسوس ہوا کرتا تھا، یہاں آ کر خدا کی مہربانی سے وہ بھی محسوس نہیں ہوا۔اور ڈاکٹر نے بھی کہا تمھارے دل کی حالت بڑی اچھی ہے۔لیکن تم پھلوں کا استعمال زیادہ کرو۔چنانچہ ہر روز صبح تین چار مالٹوں کا رس نکال کر پی لیتا ہوں۔یہاں مالٹے بہت اچھے ہوتے ہیں۔میٹھے اور رس بھرے! صبح کی چائے تو یہاں آ کر چھوٹ گئی ہے۔کیونکہ یہاں اس کا رواج ہی نہیں۔خود ہی مالٹوں کا رس نکال کر پی لیتا ہوں۔چائے کی تلافی ہو جاتی ہے۔

یہاں میرے کام کے اوقات ہیں—— ایک بجے دوپہر سے رات کے ساڑھے نو بجے تک۔ہم ہر روز یہاں کے وقت کے مطابق رات کے سوا نو بجے اپنا پروگرام براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔اسے لندن میں بی۔بی۔سی والے ریکارڈ کر لیتے ہیں۔اور پھر پاکستان کے وقت کے حساب سے دن کے سوا دو بجے براڈ کاسٹ کر دیتے ہیں۔حیرت ہے کہ اس دوہری ریکارڈنگ کے باوجود آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ریڈیو میں ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تم روز کے روز میری خیریت سے تو باخبر رہتی ہو۔اگرچہ میں نہیں رہ سکتا۔تم خود خط نہ لکھ سکو تو نسرین اور سیمیں (۸۱) سے ہر دوسرے تیسرے دن خط لکھوا کر مجھے بھیج دیا کرو۔بلّو کا قلم پکڑ کر اس سے بھی کبھی کبھی خط لکھوایا کرو۔ تاکہ میں اسے چوموں اور آنکھوں سے لگاؤں۔

کراچی میں مختار سے ملاقات ہوئی لیکن اس نے عجیب و غریب بیزاری کا اظہار کیا۔پہلے دن جب میں وہاں پہنچا ہوں تو وہ اڈّے کی بجائے اورینٹ ایرویز کے دفتر میں میرا انتظار کرتا رہا۔لیکن مجھے امین اپنے ساتھ لایا تھا۔اور امین کا گھر چونکہ اڈّے سے قریب ہے، اس لیے میں سیدھا امین کے ہاں چلا آیا۔دوسرے دن مختار سے اس کے سکول میں ملا تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔میں نے کہا کہ بھئی ان حالات میں میں براہِ راست اڈّے سے امین کے گھر چلا گیا۔معافی چاہتا ہوں۔لیکن شام کو جب وہ امین کے ہاں مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو تین چار آدمیوں کے سامنے اس نے نہایت بے ہودہ گفتگو کی۔اور پھر مجھے چھوڑنے کے لیے بھی اڈّے تک نہیں گیا۔حالانکہ کئی اور دوست گئے۔بعض کو تو وہی ''گمراہ'' کر کے واپس ساتھ لے گیا! معلوم نہیں، اس کے اس رویّے کے کیا معنی ہیں۔اسے میں نہایت عزیز رکھتا ہوں۔جہاں اس قدر قلبی تعلقات ہوں وہاں تھوڑی بہت کوتاہیاں نظر انداز بھی کر لینی چاہئیں۔لیکن اس نے جس انداز سے گفتگو کی وہ بے حد حیرت انگیز تھا۔اور باوجود اس کے کہ میں لگاتار افسوس کا اظہار اور اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہاں ابھی تک کوئی نئے لوگ زیادہ دوست نہیں بنے، اکثر جنھیں جانتا ہوں، جنرل اسمبلی کی وجہ سے مصروف نظر آتے ہیں۔اس لیے کہیں سنیما یا تھیٹر وغیرہ بھی نہیں جا سکا۔اتوار تعطیل کا دن ہوتا ہے۔وہ بھی کمرے میں بند، پڑھنے یا سونے میں گزار دیتا ہوں۔اس لیے فی الحال تمھیں نیویارک کے بارے میں مزید کچھ نہیں لکھ سکتا۔

یہاں سب کا یہی مشورہ ہے کہ بچوں کو بلا لو۔خرچ میں کمی ہوگی اور آرام سے رہو گے۔ایک انگریز سے باتیں ہو رہی تھیں۔میں نے کہا میری بیوی انگریزی زیادہ نہیں جانتی۔معلوم نہیں اس سے کس حد تک گھاٹے میں رہیں گی۔کہنے لگا امریکہ میں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو انگریزی نہیں بولتے۔انگلستان میں اس کے برعکس اگر کوئی انگریزی نہ جانتا ہو تو سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ افریقہ کے جنگل سے آ گیا ہے۔لیکن امریکہ میں کسی کو اس قسم کا احساس نہیں ہوتا بلکہ لوگ اس چیز کو برداشت کر لیتے ہیں۔اور یہاں آ کر اگر ایسے علاقے میں رہیں جہاں امریکن مردوں اور عورتوں سے میل جول ہوتا رہے، تو انگریزی یوں بھی جلد سیکھ جائیں گی۔

سب سے مشکل بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔اگر بچے یہاں آئیں تو سال میں دو ہزار سات سو روپے کا الاؤنس تیار ہو جائے گا۔اور یہاں داخل ہوں تو فی بچّہ سال کا بارہ سو روپیہ خرچ ہوگا۔یعنی چار بچوں کا چار پانچ ہزار کے لگ بھگ۔تعلیم کا خرچ بے حد ہے۔اگرچہ تعلیم ہمارے ہاں کی تعلیم سے کئی گنا اچھی ہے۔کتابیں تو اتنی نہیں پڑھاتے، لیکن ویسے بہت کچھ سکھاتے ہیں۔

جہاں تک تمھاری بیماری کا تعلق ہے، اس کے علاج کے لیے بھی یہاں بے حد سہولتیں ہیں۔اگرچہ علاج بھی اچھا خاصہ منہگا ہے۔لیکن اقوام متحدہ والے ہر قسم کے علاج اور دوا دارو کا خرچ ادا کر دیتے ہیں۔

میں تمھارے لیے جلد رقم بھیجوں گا۔ابھی ذرا میری تنخواہ کے کاغذات زیرِ غور ہیں۔چند دنوں میں فیصلہ ہو جائے گا۔

ننھیوں اور بلّو کو بہت بہت پیار۔عزیزہ ذکیہ (۸۲) اور اس کے بچوں کو دعائیں۔

اقبال صاحب اپنے بچوں کو کب لا رہے ہیں۔امید ہے وہ ہر طرح آرام سے ہوں گے۔

تمھارا راشد

(۶)

نیویارک

۱۰۔نومبر ۱۹۵۲ء

میری جان، تمھارے پہلی اور پانچویں نومبر کے خط آج ایک ساتھ ملے۔میں آج صبح ایک اور ہوٹل میں منتقل ہو گیا ہوں۔یہ دفتر سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔لیکن اس میں دو کمرے میری تحویل میں ہوں گے۔ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی، جس میں صرف ناشتہ تیار ہو سکتا ہے، ایک کونے میں لگا ہوا ہے۔ٹیلی فون بھی ہے۔نہانے کے لیے اچھا خاصہ غسل خانہ بھی ہے۔ایک ٹیلی ویژن اور ایک ریفریجریٹر (۸۳) بھی ہوٹل والے دے دیں گے۔کرایہ اتنا ہی ہوگا جتنا ٹیوڈر ہوٹل میں دے رہا تھا۔صرف آنے جانے پر ہر روز بیس سینٹ یعنی کوئی دس آنے لگا کریں گے۔اس ہوٹل کا نام الگزانڈریہ ہوٹل ہے۔اس کے مالک مسٹر ہنری مارگولیس (Henry Margolis) کل پاکستان کے دورے پر روانہ ہو رہے ہیں۔انھی کے ہاتھ تمھیں کانوں کے دو ٹاپ بھجوا رہا ہوں۔یہ امین کو غائبانہ جانتے ہیں۔اور امین ہی نے ان کے نام ایک خط بھجوایا تھا۔جس وجہ سے انھوں نے خاص رعایت کر کے مجھے اپنے ہوٹل میں جگہ دے دی اور ہر طرح کی سہولت کا انتظام کر دیا۔

ماموں جان کی صحت کا حال سن کر بے حد دکھ ہو رہا ہے۔ یہاں بیٹھ کر سوائے دعا کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ اگر پھر کسی طرح میو ہسپتال میں جا سکتے ہوں اور لاہور کا کوئی ڈاکٹر خاص توجّہ دے سکتا ہو تو ممکن ہے ان کی صحت پھر بحال ہو جائے۔

بلّو کی صحت کا خاص خیال رکھو، اسے کہو میں اس کے لیے سائیکل ضرور بھیجوں گا۔ لیکن اس وقت جب مجھے پتا چلے گا کہ اس کی پڑھائی ٹھیک ہو رہی ہے۔ باقاعدہ سکول جاتا ہے۔ اور وہاں سب لڑکے لڑکیوں سے زیادہ ہوشیار ہو گیا ہے۔

اقبال صاحب نے ایک -/90 روپے کا بل مجھے بھیجا ہے۔ وہ میں نے دستخط کر کے آج ہی انھیں بھجوا بھی دیا ہے۔ اور کہہ دیا ہے کہ یہ رقم تمھیں فوراً دے دیں۔ میں تمھیں ۱۷۔نومبر کو ایک ہزار روپے کے لگ بھگ رقم بھجواؤں گا۔ پانچ سو تمھارے نام اور پانچ سو تمھارے حساب میں، بنک کے نام۔ بنک سے پوچھ لو کہ تمھاری کتنی رقم ابھی تک باقی ہے، مجھے تو زبانی یاد نہیں۔

تم مجھے غذا کے بارے میں نصیحتیں کر رہی ہو۔ خود گھی اور دودھ کا استعمال باقاعدہ کیوں نہیں رکھتیں؟

یہاں سردی تو ہے، لیکن مکان سب کے سب گرم ہوتے ہیں۔ یہاں طریقہ یہ ہے کہ ایک پوری ہزاروں کمروں کی عمارت میں ایک جگہ ''ائیر کان ڈی شننگ پلانٹ'' (Air Conditioning Plant) لگا ہوتا ہے۔ اس سے سب کمروں میں گرم ہوا آتی رہتی ہے۔ سب علاقوں میں پورے کے پورے محلوں کے لیے یہی انتظام ہے۔ رات کو کمرہ اتنا گرم ہوتا ہے کہ اوپر چادر تک اوڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ باہر نکلیں تو سردی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ تیز سرد ہوا چلتی ہے۔ جس سے ہاتھ سُن ہو جاتے ہیں۔

ابّا جان قبلہ کی عمر کا تقاضا ہے کہ وہ اب ایسی باتیں کریں۔ پہلے بھی وہ اکثر باتوں میں بے صبری سے کام لیا کرتے تھے۔ اب عمر سے یہ بے صبری کم تو کیا ہو گی، زیادہ ہی ہو گی۔ انھوں نے پھر لکھا ہے کہ ہمارے لیے اور عذرا کے لیے کچھ رقم ہر ماہ بھجوا دیا کرو۔ میں انھیں لکھ رہا ہوں کہ آپ اور امّی جان لاہور میں رہیے۔ میں آپ کو ہر ماہ کوئی پچھتّر روپے بھجوا دیا کروں گا۔ آپ کی پنشن ملا کر آپ کے لیے یہ خاصی رقم ہو جایا کرے گی۔ یہ پچھتّر روپے خود تمھی ان کے نام بھیج دیا کرو تو اچھا ہے۔

میں نے دفتر کے اکاؤنٹنٹ خاطر غزنوی صاحب (۸۴) کو لکھا ہے کہ وہ گھر آ کر میری نظمیں نقل کر لیں۔ اور پھر میرے پاس مسودہ درستی کے لیے بھجوا دیں، تاکہ پبلشر کو دیا جا سکے۔ انھیں میری بیاضیں ساتھ نہ لے جانے دینا، وہاں بیٹھ کر ایک دو چھٹیاں صرف کر کے نقل کر لیں تو اچھا ہے۔ (۸۵)

ننھیوں کو پیار۔ بلّو کو بہت بہت دعائیں۔ ذکیہ اور اس کے بچوں کو دعائیں۔

تمھارا

راشد

حواشی و حوالہ جات

۱۔ شعر و حکمت۔ حیدر آباد دکن: شمارہ ۳، ن م راشد نمبر، ۱۹۷۱ء۔ ص ۱۶۲

۲۔ نسرین راشد۔ مرتب؛ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام۔ اسلام آباد: اے آر پرنٹرز، ۲۰۱۰ء۔ ص ix

۳۔ ایضاً ۔ ص x

۴۔ شعر وحکمت ۔ راشد نمبر ۔ ص ۱۱

۵۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام ۔ ص x

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ ''امی میں تمھاری ہوں'' اور ''وقت کا آسمان'' ن م راشد اور ان کے بھائی ف م ماجد کی مشترکہ کاوش ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پر بطور مترجم صرف راشد ہی کا نام مندرج ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد فخر الحق نوری۔ ن م راشد۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، اردو۔ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور: ۱۹۹۷ء۔ ص ۳۴۶ تا ۳۴۹

۱۰۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام ۔ ص xi

۱۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون ''ن م راشد اور خاکسار تحریک'' مشمولہ، بنیاد۔ لاہور: شمارہ ۱، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۴ تا ۱۹۳

۱۲۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام ۔ ص xii

۱۳۔ ''میرے والد'' مشمولہ، ڈاکٹر آفتاب احمد۔ راشد-شاعر اور شخص۔ لاہور: ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء۔ ص ۱۳

۱۴۔ محمود انور جنجوعہ نے راقم کے سوالنامے کا تحریری جواب ۱۹۹۲ء میں اس وقت ارسال کیا تھا جب راقم ڈاکٹریٹ کی سطح پر تحقیق کر رہا تھا۔

۱۵۔ راقم کو اس مفصل انٹرویو کی نقل ۱۹۹۱ء میں فخر محمد ماجد سے حاصل ہوئی تھی۔ گذشتہ برس یہ انٹرویو شائع بھی کر دیا گیا ہے۔ دیکھیے: ڈاکٹر سعادت سعید و نسرین انجم بھٹی (مرتبین) راشد بقلم خود۔ لاہور: جی۔سی یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء۔ ص ۲۷

۱۶۔ محمد فخر الحق نوری۔ ن م راشد۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، اردو۔ ص ۸۹

۱۷۔ ایضاً ۔ ص ۹۰ تا ۹۲

۱۸۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام ۔ ص ۱۶۶

۱۹۔ ایضاً ۔ ص ۱۶۹

۲۰۔ ایضاً ۔ ص ۱۸۱

۲۱۔ ایضاً ۔ ص ۱۸۳

۲۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۰۵ تا ۲۰۶

۲۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۰۸

۲۴۔ ابو النصر محمد خالدی۔ مرتب؛ تقویمِ ہجری وعیسوی۔ دہلی: انجمنِ ترقی اردو (ہند)، ۱۹۷۷ء۔ ص ۶۸

۲۵۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام ۔ ص ۱۸۳

۲۶۔ کلاسیک۔ راولپنڈی: ظہیر ایسوسی ایٹس، جنوری ۱۹۸۶ء۔ ص ۳۷۸ تا ۴۰۶

۲۷۔ ادبیات۔اسلام آباد: جلد ۱۷،شمارہ ۲۷، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء۔ص ۱۴۲ تا ۱۴۴

۲۸۔ نسیم عباس احمر۔مرتب؛ ن م راشد کے خطوط۔لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء۔ص ۲۳۵ تا ۲۵۹

۲۹۔ محمد فخر الحق نوری۔ن م راشد۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، اردو۔ص ۹۸

۳۰۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام۔ص xii

۳۱۔ ڈاکٹر سعادت سعید ونسرین انجم بھٹی (مرتبین) راشد بقلم خود۔ص ۵۴

۳۲۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام۔ص ۶ تا ۷

۳۳۔ ''میرے والد''مشمولہ، راشد-شاعر اور شخص۔ص ۱۳

۳۴۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام۔ص ۵

۳۵۔ ایضاً ۔ ص ۴۸

۳۶۔ ان میں سے اکثر معلومات راقم نے نوّے کی دہائی میں اس وقت حاصل کیں جب ڈاکٹریٹ کی سطح پر تحقیق کا سلسلہ جاری تھا۔اس مقصد کے لیے راشد کے مصاحبوں اور مختلف مقامات پر شائع شدہ ان کے حالات وکوائف کے علاوہ ان کے اعزہ واقربا کے ساتھ کیے گئے انٹرویو وغیرہ بروے کار لائے گئے جن کی تفصیل راقم کے مقالے ''ن م راشد-تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔جو سانحات راقم کے مقالے کی تکمیل کے بعد وقوع پذیر ہوئے، ان سے متعلق معلومات چند دیگر مصادر سے حاصل کی گئی ہیں جن میں درج ذیل مآخذ شامل ہیں:

(i) نسرین راشد۔''میرے والد ن م راشد'' مشمولہ، ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام۔ص ix تا xiii

(ii) Fariha Rashed. "The Last Poem" included in, Tehzib-Montreal: Vol: 5, No:2, Summer 2006, Page 10 to 11.

۳۷۔ ڈاکٹر سعادت سعید ونسرین انجم بھٹی (مرتبین) راشد بقلم خود۔ص ۱۷ تا ۲۷

۳۸۔ ''میرے والد''۔مشمولہ، راشد-شاعر اور شخص۔ص ۱۳

۳۹۔ ڈاکٹر آفتاب احمد۔راشد-شاعر اور شخص۔ ص ۱۰۷

۴۰۔ راقم کو یہ غیر مطبوعہ خط ۱۹۹۱ء میں فخر محمد ماجد سے دستیاب ہوا تھا۔

۴۱۔ ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام۔ص ۴۴ تا ۴۵

۴۲۔ راقم کو یہ غیر مطبوعہ خط ۱۹۹۱ء میں فخر محمد ماجد سے دستیاب ہوا تھا۔

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ ڈاکٹر سعادت سعید ونسرین انجم بھٹی (مرتبین) راشد بقلم خود۔ص ۲۷

۴۵۔ ''ن م راشد'' مشمولہ، نقوش۔لاہور: شمارہ ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر 2، اکتوبر ۱۹۵۶ء۔ص ۱۱۱۱
اس میں غیر مدوّن/متروک نظم ''مجھے کس سے پیار ہے'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ راوی۔جلد

۲۵،شمارہ ۱، بابت اکتوبر ۱۹۳۰ء (ص ۶) میں بنام ن م راشد وحیدی شائع ہوئی تھی۔

۴۶۔ نیا دور۔ کراچی: شمارہ ۱۷-۲۷، ن م راشد نمبر، سنہ ندارد، ص ۱۵۹

۴۷۔ بحوالہ، ساقی فاروقی۔ 'حسن کوزہ گر' مشمولہ، نیا دور۔ کراچی: ن م راشد نمبر، ص ۳۱

۴۸۔ راقم کو یہ غیر مطبوعہ خط ۱۹۹۱ء میں فخر محمد ماجد سے دستیاب ہوا تھا۔

۴۹۔ ان دنوں صفیہ امّید سے تھیں، جس کے باعث راشد ان کے لیے معمول سے زیادہ فکر مند رہتے تھے۔

۵۰۔ راشد کے ماموں اور سسر مولوی عبدالرسول (بی۔اے، بی۔ٹی) جو محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور انسپکٹر آف سکولز کے عہدے تک پہنچے۔ راشد نے انھیں صفیہ کو ملتان بھجوانے کے لیے لکھا ہوگا جو دورانِ حمل اپنے میکے میں قیام پذیر تھیں۔ وہ ایسا کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

۵۱۔ راشد کے والد راجا فضل الٰہی چشتی (۱۸۸۷ء-۱۹۶۴ء) جن کا تاریخی نام فیروز بخت تھا جس سے ہجری سنہ ولادت کی مناسبت سے ۱۳۰۵ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ تعلیمی اہلیت کے اعتبار سے وہ بی۔اے، بی۔ٹی تھے۔ انھوں نے محکمۂ تعلیم میں اپنی ملازمت کا آغاز جونیئر اینگلو ورنیکلر ٹیچر کی حیثیت سے کیا اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے تک پہنچے۔ جب یہ خط لکھا گیا، فضل الٰہی چشتی صفیہ کو راشد کے پاس ملتان بھیجنے کے حق میں نہیں تھے۔

۵۲۔ صفیہ کی والدہ اور راشد کی ممانی اور ساس صغریٰ بی بی۔

۵۳۔ محمود انور جنجوعہ جو صفیہ کے حقیقی بھائی اور راشد کے برادرِ نسبتی تھے۔ یہ بی۔اے، بی۔ٹی تھے اور ضلع گوجرانوالا کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔

۵۴۔ بعد ازاں صفیہ نے اسی بچّی کو جنم دیا جس کے متعلق 'تمہید' میں بتایا گیا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر معذور تھی۔

۵۵۔ راشد صفیہ کو پیار سے فیّو بھی کہتے تھے۔ یہ بے معنی نام اس زمانے کے اور خطوں میں بھی نظر آتا ہے۔

۵۶۔ اس کی تفصیل راشد کے اپنے والد کے نام ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو رقم کردہ خط میں ملتی ہے۔ راقم کو یہ غیر مطبوعہ خط بھی ۱۹۹۱ء میں فخر محمد ماجد ہی سے حاصل ہوا تھا۔ لکھتے ہیں:

''....میرا کام یہاں پاکستان کے لیے اردو میں خبریں تیار کرنا ہے۔ یہ پندرہ منٹ کا پروگرام نیویارک سے لندن میں ریکارڈ کیا جاتا ہے اور پھر پاکستان کے لیے بی۔بی۔سی سے ۱۶ اور ۱۹ میٹرز پر پاکستان کے وقت کے حساب سے دن کے سوا دو بجے براڈ کاسٹ ہوتا ہے۔ میں خود خبریں پڑھتا ہوں۔ شاید آپ میری آواز سن سکیں۔ ہفتے میں چھے دن پروگرام ہوتا ہے۔ اتوار کو تعطیل کی جاتی ہے۔''

۵۷۔ راشد کی والدہ حُسین بی بی (۱۸۹۲ء-۱۹۵۷ء) جو راجپوت جنجوعہ برادری کے ایک متدین بزرگ مولوی غلام حیدر کی صاحبزادی تھیں۔ موصوف محکمہ انہار میں ہیڈ کلرک کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ حُسین بی بی کی شادی فضل الٰہی چشتی کے ساتھ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی۔ راشد ان کے پہلے زندہ فرزند تھے۔

۵۸۔ حُسین بی بی کی حقیقی بہن اور راشد کی خالہ جوان کی پہلی آئیڈیل ادبی شخصیت، ماہنامہ قوسِ قزح-لاہور کے مدیر محمد وحید کیلانی کی اہلیہ تھیں۔ محمد وحید کیلانی وہی ہیں جنھوں نے نذر محمد کو راشد کا تخلّص دیا۔ راشد کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ابتدائی دور میں وہ اپنے نام کے ساتھ وحیدی کا لاحقہ استعمال کر کے راشد وحیدی لکھتے اور کہلاتے رہے۔

۵۹۔ مختار جہاں راشد کی چاروں چھوٹی بہنوں میں ممتاز جہاں کے بعد دوسرے نمبر پر تھیں۔ راشد ان سے سات سال بڑے تھے۔ انھیں صفورہ بھی کہا جاتا تھا۔

۶۰۔ ان کا پورا نام غلام محی الدین مرزا تھا۔ یہ راشد کے بہنوئی اور مختار جہاں کے شوہر تھے۔ انھوں نے معاشیات میں ایم۔اے کر رکھا تھا اور محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ یہ مختلف کالجوں میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔

۶۱۔ پروفیسر غلام محی الدین مرزا اور مختار جہاں کے فرزند ارجمند خالد شہزاد جنھیں ان کے اہل خاندان عام طور پر خالدی کے نام سے پکارتے ہیں۔

۶۲۔ راشد کے چھوٹے بھائی فخر محمد ماجد کی اہلیہ۔ یہ ان کی خالہ زینب کی بیٹی ہیں جو محمد وحید کیلانی کی زوجہ تھیں۔

۶۳۔ صفیہ کی والدہ اور راشد کی ممانی اور ساس صغریٰ بی بی۔

۶۴۔ غالباً راشد کی ممانی اور ساس صغریٰ بی بی کی بہن یا سسرالی رشتہ داروں میں کوئی اور بزرگ خاتون۔

۶۵۔ راشد کی سالی عطیہ کا بیٹا فرزوق جسے اہلِ خاندان بالعموم ڈوڈی صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کے والد کا نام عبداللطیف تھا۔ فرزوق غالباً غلطی سے رکھا گیا نام ہے۔ شاید فرزدق نے فرزوق کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۶۶۔ راشد کے نہایت گہرے اور دیرینہ دوست امین حزیں اور ان کی اہلیہ لطیفہ بیگم مراد ہیں۔

۶۷۔ افسانوی ادب کا معروف اور معتبر نام غلام عباس (۱۹۰۹ء-۱۹۸۲ء) جو راشد کے بہت عزیز دوست تھے۔ ان کی یادگار تخلیقات میں تین افسانوی مجموعے 'آنندی'، 'کن رس' اور 'جاڑے کی چاندنی' اور دو ناولٹ 'جزیرۂ سخن وراں' اور 'گوندنی والا تکیہ' شامل ہیں۔

۶۸۔ 'منزلِ شب' اور 'سی حرفی' کے خالق معروف شاعر مختار صدیقی (۱۹۱۷ء-۱۹۷۲ء) جن سے راشد کی دوستی رشتہ داری میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ راشد کی خواہرِ نسبتی ذکیہ کے شوہر اور اس حوالے سے راشد کے ہم زلف تھے۔

۶۹۔ 'چند افسانے کچھ نفسانے' کے خالق اعجاز حسین بٹالوی (۱۹۲۳ء-۲۰۰۴ء) جنھوں نے پہلے براڈ کاسٹر اور بعد میں بیرسٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ یہ اپنے بھائیوں عاشق حسین بٹالوی اور آغا بابر کی طرح خود بھی علم پرور اور ادب دوست شخصیت کے حامل تھے۔ راشد سے ان کی گہری دوستی تھی۔

۷۰۔ ان کے شخصی کوائف کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی مگر سیاق وسباق سے پتا چلتا ہے کہ ان کے اور راشد کے مابین وجہ دوستی براڈ کاسٹنگ تھی۔

۷۱۔ پیار سے اپنے فرزند ارجمند شہریار راشد کو بٹُو کہا ہے جو اس وقت چھے سال سے بھی کم عمر کے تھے۔ ان کے شخصی کوائف 'تمہید' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۷۲۔ جیسا کہ اگلے جملے سے بھی ظاہر ہے، اس سے مراد راشد کی بیٹیاں نسرین، یاسمین اور شاہین ہیں۔

۷۳۔ خط میں غلطی سے پانچ سو روپے کے بجائے پانچ روپے لکھ دیا گیا ہے، جس کی درستی راقم نے عبارت میں کر دی ہے۔

۷۴۔ براڈ کاسٹر چودھری محمد اقبال مراد ہیں جو آل انڈیا ریڈیو لاہور اور دہلی میں راشد کے ہم کار رہے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے راشد کی نیویارک روانگی پر ان کی جگہ چودھری محمد اقبال ہی کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ موصوف ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں ریجنل ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

۷۵۔ کرنل راحت سعید چھتّاری (۱۸۸۸ء-۱۹۸۱ء) مراد ہیں جو فارن سروس میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ یہ نیویارک میں راشد کے پیش رو تھے۔ یہاں راشد کو اقوام متحدہ کی ملازمت دلوانے میں ان کا کردار بھی تھا۔ راشد کے ان کے ساتھ بہت اچھے مراسم تھے۔ راحت چھتّاری عمان (اردن) میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

۷۶۔ 'پطرس کے مضامین' کے خالق مشہور مزاح نگار سیّد احمد شاہ پطرس بخاری (۱۸۹۸ء-۱۹۵۸ء) گورنمنٹ کالج لاہور میں راشد کے استاد بھی رہے اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں ان کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ راحت سعید چھتّاری کی طرح یہ بھی نیویارک میں راشد کے پیش رو تھے۔ یہ ۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب مقرر کیے گئے اور ۱۹۵۴ء میں اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات میں ڈپٹی سیکریٹری جنرل بنائے گئے۔ راشد کو اقوام متحدہ کی ملازمت دلوانے میں ان کی کوشش بھی شامل تھی۔

۷۷۔ آغا اشرف بھی نیویارک میں راشد کے پیش رو تھے۔ یہ ایک علم دوست اور ادب نواز شخصیت کے حامل تھے۔ ان سے بھی راشد کا دیرینہ تعلق تھا۔

۷۸۔ بلّو بھی بُجّو کی طرح پیار سے اپنے فرزند ارجمند شہریار راشد ہی کو کہا ہے جو اس وقت چھے سال سے بھی کم عمر کے تھے۔ ان کے شخصی کوائف 'تمہید' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۷۹۔ ارشاد پشاور میں راشد اور ان کے اہلِ خانہ کا خدمت گزار ملازم تھا۔

۸۰۔ راشد کے چھوٹے بھائی راجا فخر محمد ماجد (۱۹۲۴ء-۲۰۰۰ء) کو پیار سے فخری کہا جاتا تھا۔ انھوں نے ایک سے زیادہ مضامین میں ایم۔اے کی ڈگری لے رکھی تھی۔ سیاسیات ان کا خاص شعبہ تھا۔ یہ لیکچرار کی حیثیت سے محکمۂ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہوئے اور پرنسپل کے عہدے تک پہنچے۔ قرطاس و قلم کے ساتھ ان کا رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔ یہ 'اردو ڈائجسٹ' اور بزمِ اقبال کے مجلّہ 'اقبال' کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ جب زیرِ نظر خط رقم کیا گیا، یہ مانٹریال (کینیڈا) میں غالباً ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے مگر اس کی تکمیل نہ کر سکے۔

۸۱۔ راشد کی بیٹی یاسمین راشد جنھیں گھر میں پیار سے سیمیں بھی کہہ لیا جاتا تھا۔ ان کے شخصی کوائف 'تمہید' میں آ چکے ہیں۔

۸۲۔ راشد کی خواہرِ نسبتی جو مختار صدیقی کی اہلیہ تھیں۔

۸۳۔ خط میں غلطی سے ریفریجیٹر لکھ دیا گیا ہے جس کی راقم نے عبارت میں درستی کر دی ہے۔

۸۴۔ 'خواب در خواب'، 'سانپ کی چھتری' اور 'کونجاں' وغیرہ کے خالق محمد ابراہیم بیگ خاطر غزنوی (۱۹۲۵ء-۲۰۰۸ء) جو ریڈیو پاکستان پشاور میں راشد کی ماتحتی میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعد میں پشاور یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ عمر بھر قرطاس و قلم کے ساتھ رشتہ استوار رکھا۔ راشد کے ان کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ راقم کے پاس ان کے نام ۱۰ر نومبر ۱۹۵۲ء سے ۳ر نومبر ۱۹۶۰ء کے دوران راشد کے رقم کردہ نو خطوط کی عکسی نقول محفوظ ہیں جو ۱۹۹۲ء میں خاطر غزنوی نے خود ارسال کی تھیں۔ ان میں سے بعض خطوں میں راشد کے دوسرے شعری مجموعے 'ایران میں اجنبی' کی اشاعت کی منصوبہ بندی کا پتا چلتا ہے جو گوشۂ ادب، لاہور سے ۱۹۵۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

۸۵۔ اس ضمن میں خاطر غزنوی کے نام ۱۰ر نومبر ۱۹۵۲ء ہی کو رقم کردہ خط میں راشد رقمطراز ہیں:

''....میری نظموں کے دوسرے مجموعے کے لیے اگر آپ ہمت کریں تو شائع ہو جائے۔ دو تین بیاضیں گھر میں پڑی ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو ان میں سے کچھ نظمیں نقل کر لیجیے۔ اتنی کہ ان سے ایک مجموعہ تیار ہو سکے۔ مثلاً تیس کے لگ بھگ۔ وہ نظمیں پھر مجھے نظر ثانی کے لیے یہاں بھجوا دیجیے۔ تا کہ میں ان کی آخری 'اصلاح' کر دوں۔ اس کے بعد ان ناشرین کو جن سے آپ نے بات کی تھی، یہ مجموعہ بھجوا دیا جائے۔ اور انھی شرائط پر جو سوچی گئی تھیں، اس کی اشاعت کا معاہدہ ہو جائے۔ یہ کام اگر آپ کر دیں تو آپ کا بیحد ممنون ہوں گا۔ میں اپنی بیگم کو خط لکھ رہا ہوں کہ وہ آپ کو نظمیں نقل کرنے کی مہلت دے دیں۔ بیاضوں کو ساتھ لے جانا تو مناسب نہ ہوگا۔ کسی اتوار کو وہیں ہمارے ہاں بیٹھ کر نظمیں نقل کر لیجیے۔ ایک دو اتوار ضائع کر دیجیے۔ یا ایک دو آدمی مل کر یہ کام کر لیجیے تا کہ وقت بچ جائے.....'' (غیر مطبوعہ)

مندرجہ بالا خط کا حوالہ دیتے ہوئے ۲۵ر نومبر ۱۹۵۲ء کے مرقومہ خط میں راشد نے خاطر غزنوی کو یاد دہانی کرائی ہے۔ لکھتے ہیں:

''...آپ کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔ معلوم نہیں آپ کو وہ خط ملا بھی یا نہیں.... میرے گھر جا کر، نظموں کی بیاضیں لے کر نظمیں نقل کر لیجیے۔ اور وہ مجھے بھجوا دیجیے تا کہ دوسرا مجموعہ تیار ہو سکے....'' (غیر مطبوعہ)

کمشنر ز آفس - ملتان -
۱۳ جون ، ۱۹۴۷ء

پیاری جان صفیہ ،

کئی دنوں سے تمہاری طرف سے کوئی خط نہیں آیا۔ میرے خطوں کا تم نے کوئی جواب دیا۔ بے حد حیرت ہے۔ تم کیا جانو کہ تمہارا خط نہ ملنے سے میں کس قدر پریشان ہو جاتا ہوں۔ بالخصوص ان دنوں تو میں چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ تمہاری خیر و عافیت کی خبر ملتی رہے۔ یہ تو ممکن نہیں۔ لیکن ہر دوسرے تیسرے دن تمہارا خط آنا نہایت ضروری ہے۔ اگر نہیں لکھو گی تو ایک طرف اپنی صحت کے بارے فرض میں کوتاہی کرو گی، دوسرے میرے دل کو رنج پہنچاؤ گی۔ کیا اب میں ہی تمہارے لئے سب کچھ نہیں؟ اگر مجھ کو تم اتنے دن دل سے بھلا دے رکھو تو بے حد افسوس ہے۔ میری یہ حالت ہے کہ ایک لمحہ بھی تمہاری یاد کے بغیر نہیں گذرتا۔ تمہیں ملنے کی آرزوئیں شب و روز بے قرار رکھتی ہیں۔

میں نے تو لکھا تھا کہ تم ۱۵ جون سے پیشتر یہاں میرے پاس، میری آغوش میں پہنچ جاؤ۔ لیکن شاید خط ابو جان قبلہ کو نہیں ملا ہوگا کہ انہوں نے تحریر فرمایا کہ صفیہ کو جون کے آخر تک رہنے دیا جائے۔ ابا جان قبلہ سے تو میں اصرار کرتا ہوں۔ لیکن امی جان سے نہیں۔ ان کا حسن سلوک دیکھ کر جی نہیں چاہتا کہ ان کا دل توڑوں۔ لیکن بہتر ہو کہ اپنی امی جان کو سمجھا کر، میں ۱۵ جون کو ملتان جا رہا ہوں۔ بشرطیکہ تم واقعی آنا چاہتی ہو، رشید محمود کو ساتھ لے کر یہاں پہنچ جاؤ۔ وہ ایک دو دن کی رخصت لے لے گا۔ میرا دل اب اتنا بے قرار ہو رہا ہے کہ میں مشکل گوارا کر سکتا ہوں کہ تم سے اتنے دن اور جدا رہوں۔

آج سے ہمارے دفتر کے وقت بدل گئے ہیں۔ یعنی ۷ بجے صبح جا کر ایک بجے آیا جاتا ہے۔ پہلے تو دفتر میں دن کا اہم حصہ جو تمہارا خیال ہوتا ہو وقت میں گذر جاتا تھا۔ اب آج ہی ایک بجے واپس آکر دوپہر کی سنسان تنہائی کی بڑی زیادہ شدت محسوس کر رہا ہوں۔ اب تو معلوم نہیں یہ سارے دن کیسے گذارا کروں گا۔ اگر تم ہوتیں تو یہ دوپہر کس طرح کٹتیں۔ پلنگ پر ایک ساتھ ایک دوسرے کی آغوش میں۔ بے پناہ پیار کرتے ہوئے جیسے ہم کیا کرتے ہیں۔ بے شک ہمیں وہ چیز خوب

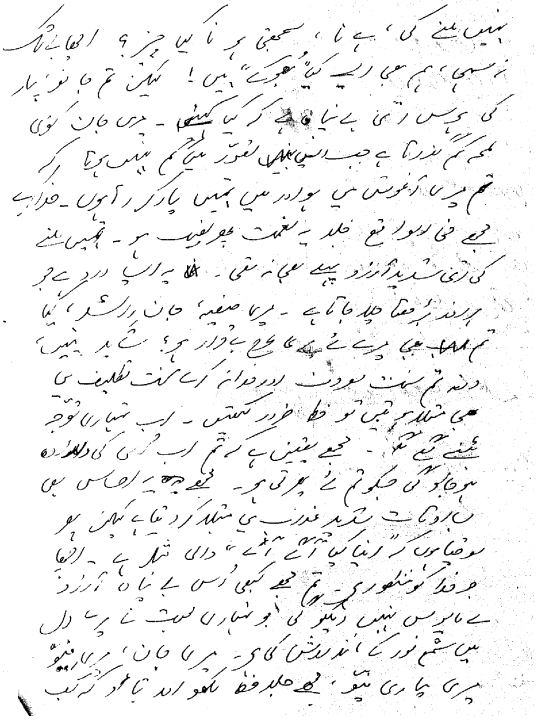

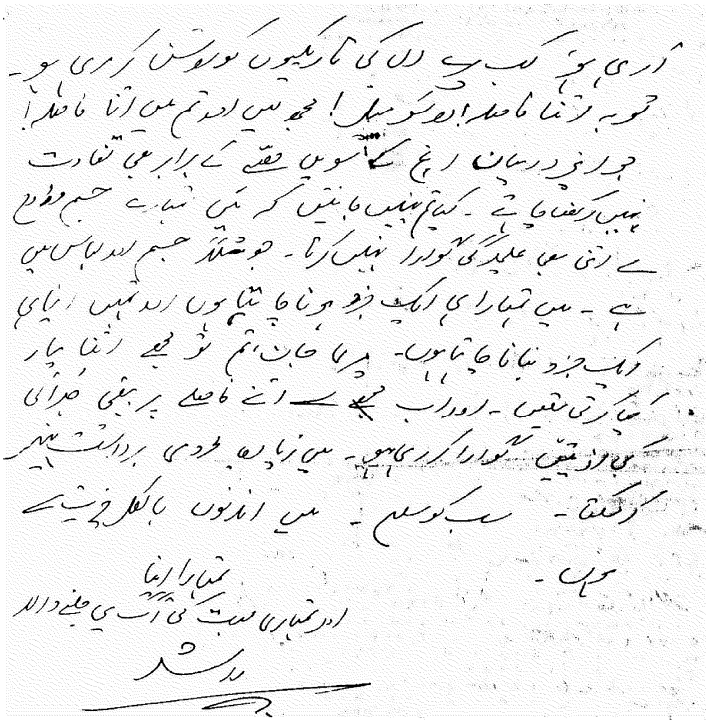

Radio Division,
United Nations,
New York
۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

صفیہ میری جان۔ میں ۱۹ر اکتوبر کی صبح کو بخیر و عافیت یہاں پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سفر بغیر کسی دشواری کے طے ہوا۔ میں نے کراچی اور لندن سے تمہیں اپنے وہاں پہنچنے کا بھی تار دے دیا تھا۔ پھر نیویارک پہنچ کر بھی ایک تار دیا تھا۔ اور کل ایک خط بھی لکھا۔ لیکن وہ خط شاید ایک مہینے کے بعد تمہیں ملے گا۔ کیونکہ اس پر پوری ٹکٹیں نہ لگ سکیں۔

میں نے آج صبح سے یہاں آ کر کام شروع کر دیا ہے۔ خدا مجھے اس میں کامیابی دے۔ آج رات سے میں خود بھی براڈکاسٹ کیا کروں گا۔ یہ پروگرام پاکستان میں 16 اور 19 میٹر پر BBC کا ہوتا ہے، دوپہر کے ڈھائی بجے (رات دو بجے تک) سنا جا سکے گا۔

مجھے رہنے کو یہاں ٹیوڈر ہوٹل میں ایک (Tudor Hotel) مختصر سا کمرہ ملا ہے۔ کمرے کے ساتھ مختصر سا غسل خانہ بھی ہے۔ لیکن کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں چلنے پھرنے کی گنجائش کم ہے۔ یہ ہوٹل کی بیس منزلیں ہیں۔ میرا کمرہ پندرھویں منزل پر ہے۔ یہ ہوٹل دفتر سے [illegible] کل رات شور کے باعث نیند کم آئی۔ گاڑیوں کا اتنا شور میں نے کہیں نہیں سنا۔ معلوم ہوتا تھا

جیسے شور، موج در موج اٹھ رہا ہے۔ جیسے مسلسل کوئی طوفان چل رہا ہو!

آج صبح یہاں اس موسم کی پہلی برفباری ہوئی لیکن برف زمین پر ٹھہری نہیں۔ سب کا کہنا ہے کہ اس دفعہ برف غیر معمولی طور پر جلد آئی ہے۔

یہ شہر ایک دوڑ کا شہر ہے۔ لوگ سڑکوں پر، گاڑیوں میں ہوں یا پیدل، بے پناہ طور پر دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس جلدی کا راز یہ ہے کہ یہاں وقت کو ڈالروں میں تولا جاتا ہے۔ جتنا وقت بچے گا اتنے ڈالر بڑھتے چلے جاتے ہیں!

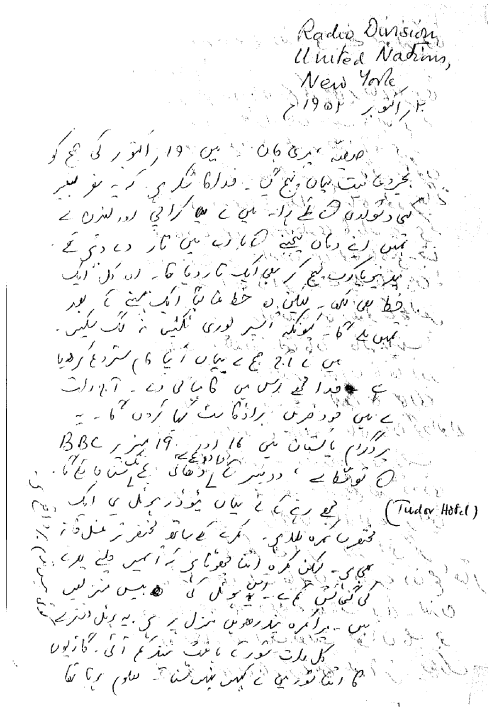

آتے ہوئے راولپنڈی میں ریڈیو کے چالیس حضرات کے علاوہ، امی جان، خالہ زینب، عزیزہ مختار، محی الدین، ایڈورڈ کا بچہ اور عبداللہ ملنے آئے ہوئے تھے۔ لاہور میں ہماری طرح چند دوستوں کے علاوہ، ماموں جان گوجرانوالہ سے بھاگم بھاگ پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے بڑی زحمت اٹھائی۔ ان کے ساتھ خالہ بیگم ملک "دودھی صاحب" تھے۔ کراچی میں ہوائی اڈے پر امین ایڈورڈ کی بیگم ملنے آئیں۔ اور اپنے گھر لے گئے جہاں رات قیام کیا۔ دوسرے دن صبح عباس، رشید مختار صدیقی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ لندن میں اعجاز ملک ایک دوست جو آج کل بی بی سی میں کام کرتے ہیں ملنے آئے۔ بیچارے

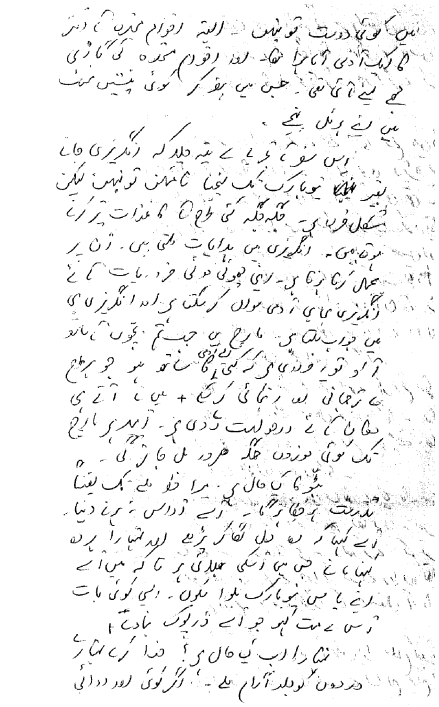

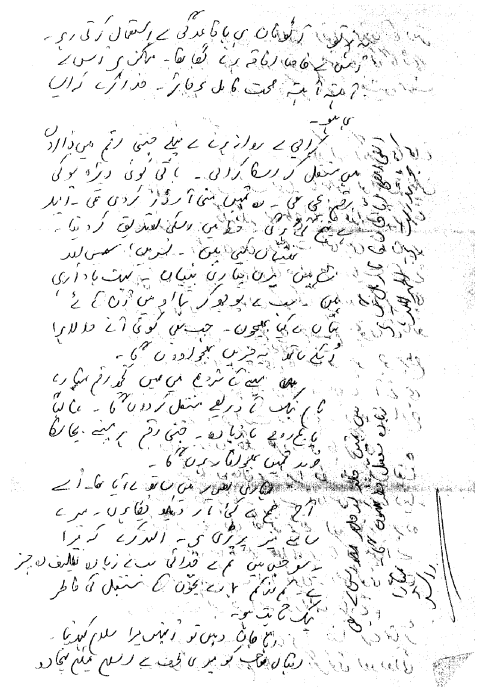

Radio Division,
United Nations,
New York USA

۲۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء

میری جان۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے ابھی مجھے خط نہیں لکھا ہوگا۔ بلکہ تم ارادہ کر رہی ہوگی۔ کاغذ نہیں ملتا ہوگا۔ دوات میں سیاہی نہیں ہوگی۔ تم ننھیاں سکول لے گئی ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یا لکھا ہوگا تو تمہارے یہاں پہنچنے میں کم از کم ایک ہفتہ لگے گا۔ تاہم میں تمہیں آج پھر یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

آج کچھ اپنے دفتر کے بارے میں۔ یونائیٹڈ نیشنز کا دفتر ہوٹل سے صرف سو دو سو قدم کے فاصلے پر ہے۔ ایک بہت بڑی عمارت۔ یوں لگتی ہے جیسے کسی نے بڑی سی اینٹ اٹھا کر آڑی رکھ دی ہو۔ چاروں طرف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ ہلکے سبز رنگ کے۔ پاس سے تو ان کا کوئی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن دور سے زمین پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہلکا فیروزی رنگ کی جھلک پڑتی ہے۔ اس عمارت کی سینتیس[37] منزلیں ہیں کہ اندر سے بے حد خوبصورت عمارت ہے۔ معمول بھلبلیاں ہیں۔ جن میں پہلے ایک آدھ دن راستہ تلاش کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ ہر منزل پر لفٹ کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ سطح زمین سے نیچے بھی ایک منزل ہے۔ جس پر ہونے کی سیڑھیوں سے اترتے چڑھتے ہیں۔ سیڑھی پر قدم رکھ کر کھڑے ہو جائیے۔ سیڑھیاں بجلی سے چل رہی ہیں۔ خود بخود نیچے لے جائیں گی

(ہمارا دفتر آٹھویں منزل پر ہے اور میرا کمرہ نمبر 814 ہے)

یا اوپر آنا ہو تو اوپر لے آئیں گی۔ اس عمارت کے اندر کوئی چار ہزار کے قریب مرد عورتیں کام کرتی ہیں۔ لفٹوں کی گائیڈیں بالعموم لڑکیاں ہیں۔ چینی لڑکیاں۔ امریکہ کی حبشنیں۔ چھوٹے چھوٹے قد کی، گھنگھریالے بالوں والی۔ [illegible] ستونوں سے [illegible] چلتے پھرتے [illegible] امریکی لہجے میں انگریزی [illegible] بولتی ہیں۔ [illegible] ہمارے دفتر میں یعنی ریڈیو ڈویژن میں [illegible] پروگرام کا سیکشن ہے۔ جس کے [illegible] انچارج ہیں۔ یہ پہلے آل انڈیا ریڈیو میں تھے۔ میرے خیال میں پاکستان کے بعد پروگرام اگزیکٹو ہو کر آئے تھے دہلی میں۔ بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ شہر سے دور مکان لے رکھا ہے۔ اپنی کار پر روزانہ آتے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ اپنی [illegible] اپنا ملازم بھی [illegible] لاتے ہیں۔ انہوں نے [illegible] اپنی [illegible] کھانے پر بلا لیا ہے۔ [illegible] دیکھو کیا [illegible] ہونے والے ہیں۔ لیکن اب تو شاید [illegible] "بھاری" ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ایک اور ہندوستانی دوست ہیں۔ جو یہاں ہیں جن [illegible] پڑھتے ہیں۔ وہ [illegible] کے ملازم نہیں [illegible] پروگرام [illegible] دیتے ہیں۔ خالی وقت میں کولمبیا یونیورسٹی میں ہندی پڑھاتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی ہوٹل سے کوئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اردو بھی [illegible] پڑھائی جاتی ہے [illegible] ایک خاتون اردو پڑھا رہی ہیں۔

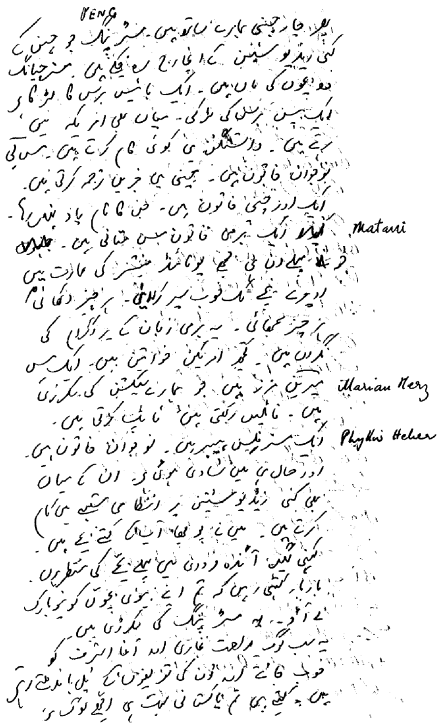

Veng

پھر چار چینی ہمارے ساتھ ہیں۔ مسٹر پنگ جو چین کے
کسی ریڈیو سٹیشن کے انچارج رہ چکے ہیں۔ مسز چیانگ
دو بچوں کی ماں ہیں۔ ایک بائیس برس کا لڑکا اور
ایک بیس برس کی لڑکی۔ میاں بیوی امریکہ میں
رہتے ہیں۔ واشنگٹن میں کوئی کام کرتے ہیں۔ مس لی
نوجوان خاتون ہیں۔ چینی میں خبریں ترجمہ کرتی ہیں۔
ایک اور چینی خاتون ہیں۔ جن کا نام یاد نہیں رہا۔
ایک برمی خاتون مس متانی ہیں۔ Matani
جو پہلے دن ہی مجھے یونائیٹڈ نیشنز کی عمارت میں
اوپر سے نیچے تک خوب سیر کرا لائیں۔ ہر چیز دکھائی اور
ہر چیز سمجھائی۔ یہ برمی زبان کے پروگرام کی
نگران ہیں۔ کچھ امریکن خواتین ہیں۔ ایک مس
میرین ہرز ہیں جو ہمارے سیکشن کی سیکرٹری Marian Herz
ہیں۔ فائلیں رکھتی ہیں اور ٹائپ کرتی ہیں۔
ایک مسز فلیس ہیبر ہیں۔ نوجوان خاتون ہیں۔ Phyllis Heber
اور حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ ان کے میاں
بھی کسی ریڈیو سٹیشن پر انتظامی شعبہ میں کام
کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کے کتنے بچے ہیں۔
کہنے لگیں آئندہ فروری میں پہلے بچے کی منتظر ہوں۔
بار بار کہتی رہیں کہ تم اپنے بیوی بچوں کو یہاں کیوں
لے آؤ۔ یہ مسٹر پنگ کی سیکرٹری ہیں۔
یہ سب لوگ مرافت بخاری اور آغا اشرف کو
خوب جانتے ہیں۔ ان لوگوں کی تعریفیں کیں۔ بلا مبالغہ کہتی
ہیں کہنے لگیں تم پاکستانی بہت ہی اچھے لوگ ہو۔

مجھے بھی مرافت بخاری اور اشرف کی قائم کی ہوئی
شہرت کو برقرار رکھنا ہوگا۔ یہ لوگ مختلف ملکی
قوموں کے رسیا ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے
کے لئے بڑی سے بڑی زحمت برداشت کرنے پر
آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں یونائیٹڈ نیشنز کی
زندگی کے کمروں میں تیز تیز دوڑتی بھاگتی دکھائی
دیتی ہیں۔ جیسے ان کا نمبر ریس دوڑ کا جیتنے کی
ہوا ہے۔ بہرحال بڑی ہوشیار اور مستعد ہیں۔
عمارت میں ہر جگہ صفائی ہے۔ کوئی سگرٹ یا دیاسلائی
کا ٹکڑا یا کاغذ کا تنکا دکھائی نہیں دیتا۔ تھوکنا
تو ایک طرف رہا جو ہمارے ملک کی سب سے بڑی لعنت
ہے۔ مجال ہے اتنے صاف ہیں کہ ترشا میں
پیشاب تک کرنا گوارا نہ ہوا۔ یہاں کا ایک
سال پہلے سب لوگوں کو بڑا انتظار تھا۔ بعض
لوگ تو کچھ برس سے کہ جس کمرے میں مجھے کام
کرنا تھا۔ آخر ان کی تلاش تھی۔ جگہ کی کمی کی
وجہ سے بعض کمروں میں دو دو آدمی بیٹھے ہوئے
ہیں۔ کا پتہ تھا کہ کم از کم یہ کمرہ مل
جائے اور ذرا آسائش سے بیٹھ سکیں۔ لیکن
ڈینیل دالیون نے یہ کمرہ میرے لئے سال بھر سے خالی
رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ اگر ایک دفعہ کوئی کمرے
میں گھس جائے تو اسے نکالنا مشکل ہے۔ میرے
ذمے روزانہ خبروں کا ترجمہ ہے نیز فی البدیہہ +
آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ دوپہر ہوگیا تھا کھانا

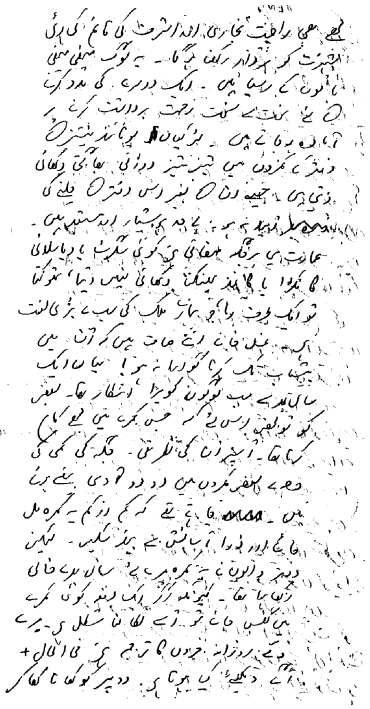

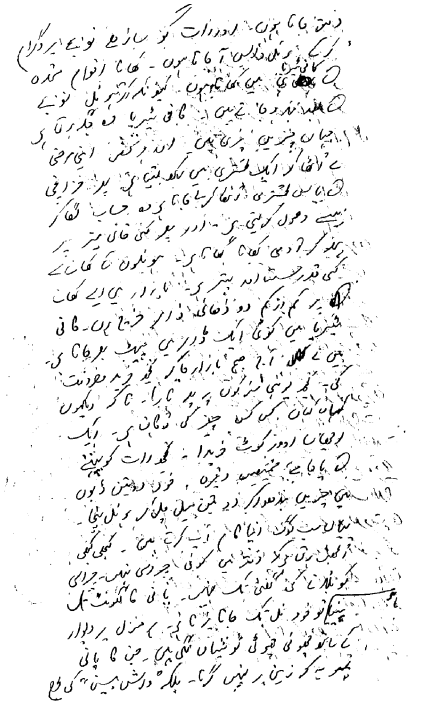

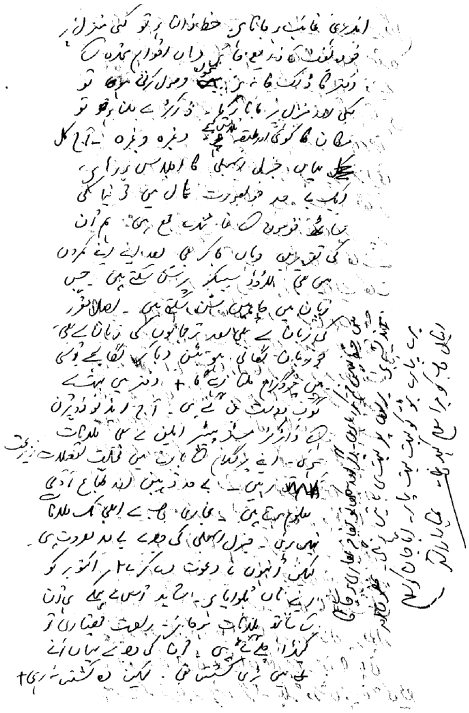

نیویارک
۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

میری جان، اس سے پہلے دو خط لکھ چکا ہوں۔ ابّا جان نے ۲۰ر اکتوبر کو پنڈی سے ایک خط ڈاک میں ڈالا اور وہ مجھے صرف چار دن کے اندر اندر یعنی آج صبح مل گیا۔ اگر تم نے بھی ایک کوئی خط لکھا ہوتا تو ضرور مل جاتا۔ لیکن میں ابھی تک منتظر ہوں۔

ابّا جان نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ یٰسٓ ۱۶ اور ۱۷ر اکتوبر کو بہت بے قرار رہا۔ لیکن ۲۰ر اکتوبر تک چلنے پھرنے ہی نہیں بلکہ دوڑنے بھاگنے اور اُچھلنے کودنے بھی لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اب تندرست ہو گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اب سکول جانے لگا ہو گا۔

میں نے پرسوں سب بچّوں کے لئے تصویری کارڈ بھیجے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ اُنہیں اس خط سے پہلے مل چکے ہوں گے۔ تم اور نغمانہ اور بلّو سب یاد آتے ہو۔ بہت یاد آتے ہو۔ ابّا جان نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جس دن میں پنڈی سے روانہ ہوا، ارشاد اپنی کوٹھڑی میں دروازے بند کر کے روتا رہا۔ یہ پڑھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اُسے یہاں منگوانے پر خرچ بہت آئے گا۔ ورنہ اُسے منگوانے کی کوشش کرتا۔ بعض لوگوں نے جن میں راحت چغتائی بھی تھے اور جن میں میرے ایک شریک کار مسٹر اوبھرائے بھی ہیں۔ اپنے نوکر منگوا رکھے ہیں۔ لیکن یہ سب پیسے کا کھیل ہے۔ سمندر کے راستے سے بھی اُسکے آنے پر کوئی ڈیڑھ ہزار روپیہ خرچ ہو جائے گا۔

مانسہرہ سے نجمی کا خط آیا ہے۔ لکھتا ہے کہ بہت پڑھنا پڑتا ہے۔ اور دن رات محنت کرنی پڑتی ہے۔

مجھے یہاں سب کچھ کٹ کٹا کر کوئی دو ہزار روپے ماہانہ ملیں گے۔ پنشن، انشورنس، ڈاکٹری امداد وغیرہ ایسی مدّیں ہیں جن کے لئے ہر مہینے ہر آدمی کو رقم کٹوانی پڑتی ہے۔ اور میرے خیال میں یہ مفید بھی ہے۔ یہ پیسے کا مفید استعمال ہے۔ میں ان شاء اللہ نومبر کے شروع میں تمہیں آدھے مہینے کی تنخواہ میں سے کوئی پانچ سو روپے کی رقم یا زیادہ تمہیں بھجواؤں گا۔ تم اس پیسے میں جتنا بھی جمع کر سکو گی اتنا ہی اچھا ہو گا۔ بچّوں کو دعائیں۔

تمہارا راشد

AIR LETTER
Via Air Mail
Par Avion
Mrs Safia Rashed,
49, The Mall,
PESHAWAR
N.W.P.P.
WEST PAKISTAN
MESSAGE MUST APPEAR ON INNER SIDE ONLY. NO TAPE OR STICKER MAY BE ATTACHED. IF ANYTHING IS ENCLOSED, THIS LETTER WILL BE SENT BY ORDINARY MAIL.
FOLD
From:-
N. M. Rashed,
Radio Division,
United Nations,
NEW York
FOLD SIDES OVER AND THEN FOLD BOTTOM UP AND SEAL.
NO OTHER ENVELOPE SHOULD BE USED.
FOLD

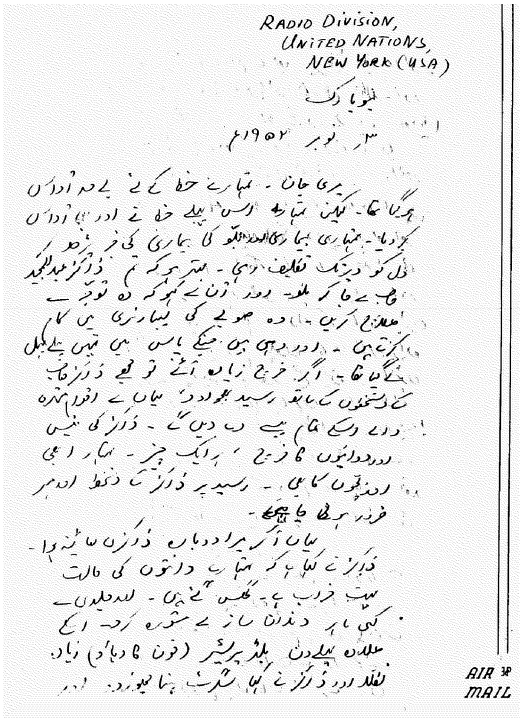

RADIO DIVISION,
UNITED NATIONS,
NEW YORK (USA)

نیویارک

۳، نومبر ۱۹۵۲ء

میری جان۔ تمہارے خط کے نہ آنے سے جی اداس ہو گیا تھا۔ لیکن تمہارے اس پہلے خط نے اور بھی اداس کر دیا۔ تمہاری بیماری اور البلّو کی بیماری کی خبر پڑھ کر دل کو دیر تک تکلیف رہی۔ بہتر ہو کہ تم ڈاکٹر عبدالمجید صاحب سے جا کر ملو۔ اور اُن سے کہو کہ وہ توجہ سے علاج کریں۔ وہ صوبے کی بیماریوں میں کام کرتے ہیں۔ اور وہی ہیں جنکے پاس میں تمہیں پہلے بھی لے گیا تھا۔ اگر خرچ زیادہ آئے تو مجھے ڈاکٹر صاحب کے دستخطوں کے ساتھ رسید بھجوا دو۔ یہاں سے اقوام متحدہ والے اسکے تمام پیسے دے دیں گے۔ ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کا خرچ، ہر ایک چیز۔ تمہارا اور بچوں کا بھی۔ رسید پر ڈاکٹر کے دستخط اور مہر ضرور ہونا چاہیئے۔

یہاں آ کر میرا دوبارہ ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہارے دانتوں کی حالت بہت خراب ہے۔ گھس گئے ہیں۔ لہٰذا جلدی سے کسی ماہر دندان ساز سے مشورہ کرو۔ اسکے علاوہ پہلے دن بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) زیادہ نکلا اور ڈاکٹر نے کہا سگرٹ پینا چھوڑ دو۔ اور

AIR MAIL

چوبیس گھنٹے کے آرام کے بعد پھر ناپا گیا اور دوسرے دن خون کا دباؤ نارمل نکلا۔ اور ڈاکٹر نے مجھے سب سے اونچے درجے میں رکھ دیا+ جن کا ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے اُن کے چار درجے مقرر ہیں۔ جن کی صحت سب سے اچھی ہو اُنہیں A کلاس میں رکھا جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ دل پر جو بوجھ سا محسوس ہوا کرتا تھا۔ یہاں آ کر خدا کی مہربانی سے وہ بھی محسوس نہیں ہوا۔ اور ڈاکٹر نے بھی کہا تمہارے دل کی حالت بڑی اچھی ہے۔ لیکن تم پھلوں کا استعمال زیادہ کرو۔ چنانچہ ہر روز صبح تین چار مالٹوں کا رس نکال کر پی لیتا ہوں۔ یہاں مالٹے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میٹھے اور رس بھرے! صبح کی چائے تو یہاں آ کر چھوٹ گئی ہے۔ کیونکہ یہاں رس کا رواج ہی بہت ہے۔ خود ہی مالٹوں کا رس نکال کر پی لیتا ہوں۔ چائے کی تلافی ہو جاتی ہے۔

یہاں میرے کام کے اوقات ہیں ایک بجے دوپہر سے رات کے ساڑھے نو بجے تک۔ ہم ہر روز یہاں کے وقت کے مطابق رات کے سوا نو بجے اپنا پروگرام براڈکاسٹ کرتے ہیں

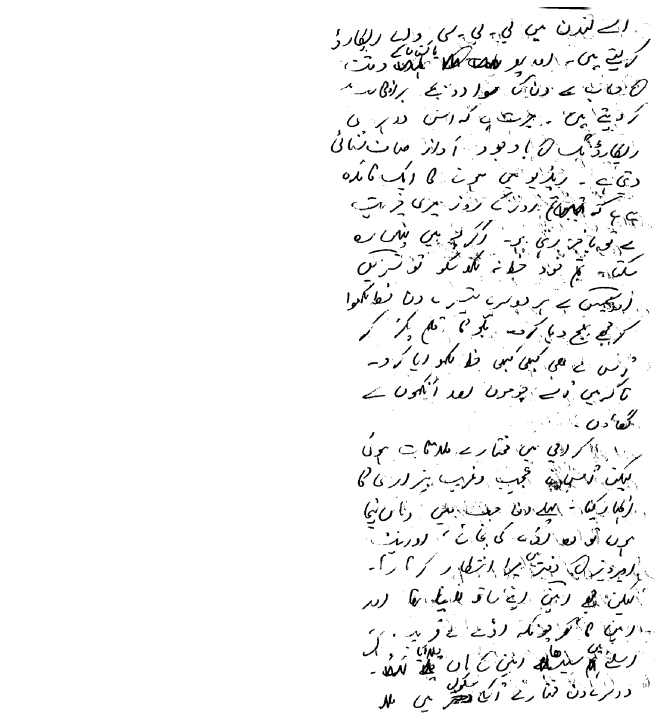

نیویارک
۱۰ نومبر ۱۹۵۲ء

میری جان تمہارے پہلی اور پانچویں نومبر کے
خط آج ایک ساتھ ملے۔ میں آج صبح ایک اور
ہوٹل میں منتقل ہو گیا ہوں۔ یہ دفتر سے تین چار میل
کے فاصلے پر ہے۔ لیکن اس میں دو کمرے میری
تحویل میں ہیں۔ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ
بھی ہے جس میں صرف ناشتہ تیار ہو سکتا ہے، ایک
کونے میں لگا ہوا ہے۔ ٹیلیفون بھی ہے۔ نہانے
کے لئے اچھا خاصہ غسل خانہ بھی ہے۔ ایک ٹیلی ویژن
سیٹ اور ایک ریفریجریٹر بھی ہوٹل
والے دے دیں گے۔ کرایہ تقریباً اتنا ہی ہے جتنا
میں ٹیوڈر ہوٹل میں دے رہا تھا۔ صرف آنے
جانے پر روز بیس سینٹ یعنی کوئی دس آنے
لگا کریں گے۔ اس ہوٹل کا نام الگزانڈریہ
ہوٹل ہے۔ اس کے مالک مسٹر ہنری HENRY MARGOLIS
مارگولیس کل پاکستان کے دورے پر روانہ
ہو رہے ہیں۔ انہی کے ہاتھ تمہیں گانوں
کے دو ریکارڈ بھجوا رہا ہوں۔ یہ ایرین کو غالباً جانتے
ہیں۔ اور ایرین ہی نے ان کے نام ایک
خط بھجوایا تھا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے خاص
رعایت کر کے مجھے اپنے ہوٹل میں جگہ دے دی
اور ہر طرح کی سہولت کا انتظام کر دیا۔
ماموں جان کی صحت کا حال سن کر بے حد
دکھ ہو رہا ہے۔ یہاں صرف دعا کروانے کے

AIR MAIL

اور کیا کر سکتا ہوں۔ اگر پھر کسی طرح ہسپتال
میں جا سکتے ہوں۔ اور ڈاکٹر کا کوئی ڈاکٹر
خاص توجہ دے سکتا ہو۔ تو ممکن ہے
ان کی صحت پھر بحال ہو جائے
ٹیلو کی صحت کا خاص خیال رکھو،
اب کے میں اس کے لئے سائیکل ضرور بھیجوں
گا۔ لیکن اس وقت جب مجھے پتہ چلے گا
کہ اس کی پڑھائی ٹھیک ہو رہی ہے۔ باقاعدہ
سکول جاتا ہے۔ اور وہاں سب لڑکے لڑکیوں
سے زیادہ ہوشیار ہو گیا ہے۔
اقبال ... نے ایک ۹۰/= روپے
کا بل مجھے بھیجا ہے۔ میں نے دستخط کر کے
آج ہی انہیں بھجوا بھی دیا ہے۔ اور
کہہ دیا ہے کہ یہ رقم تمہیں فوراً دے دیں۔
میں تمہیں ۱۷ نومبر کو ایک ہزار روپے
کے لگ بھگ رقم بھجوا دوں گا۔ پانچ سو
تمہارے نام اور پانچ سو تمہارے حساب
میں، بنک کے نام۔ بنک سے پوچھ لو
کہ تمہاری کتنی رقم ابھی تک باقی ہے،
مجھے تو زبانی یاد نہیں۔
تم مجھے ہر بار ایک بار ہی نصیحتیں
کر رہی ہو۔ خود کبھی انڈے دودھ کا
استعمال باقاعدہ کیوں نہیں رکھتیں؟
یہاں سردی تو ہے لیکن مکان
سب کے سب گرم ہوتے ہیں۔ یہاں طریقہ

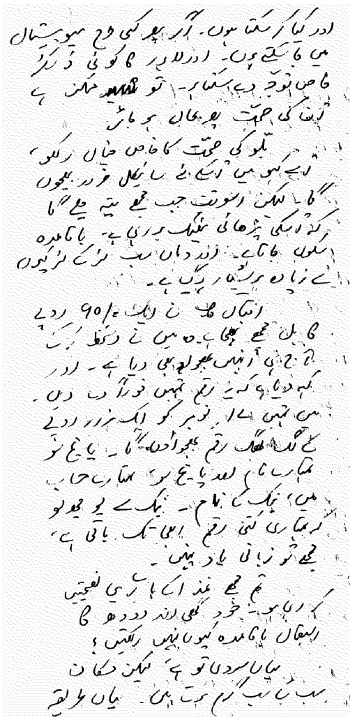

یہ ہے کہ ایک پوری ہزاروں کمروں کی عمارت میں ایک جگہ "ائیرکنڈیشننگ پلانٹ" (Air Conditioning Plant) لگا ہوتا ہے۔ اس سے سب کمروں میں گرم ہوا آتی رہتی ہے۔ [illegible] علاقوں میں یورپ کے پورے ملکوں کے لئے یہی انتظام ہے۔ رات کو کمرہ اتنا گرم رہتا ہے کہ دوہر چادر تک اوڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ باہر نکلیں تو سردی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ تیز سرد ہوا چلتی ہے جس سے ہاتھ سُن ہو جاتے ہیں۔

بابا جان قبلہ کی عمر کا تقاضا ہے کہ وہ اب ایسی باتیں کریں۔ پہلے بھی وہ اکثر باتوں میں بے صبری سے کام لیا کرتے تھے۔ اس عمر میں بے صبری کم تو کیا ہوگی زیادہ ہی ہوگی۔ انہوں نے پھر لکھا ہے کہ ہمارے لئے اور [illegible] کے لئے کچھ رقم ہر ماہ بھجوا دیا کرو۔ میں نے انہیں لکھ دیا ہے کہ آپ اور امی جان لاہور میں رہئے۔ میں آپ کو ہر ماہ کوئی پچھتر روپے بھجوا دیا کروں گا۔ آپ کی خوشی ملا کر آپ کے لئے یہ خاص رقم ہوا کرے گی۔ یہ پچھتر روپے خود تمہیں ان کے نام بھیج دیا کرو۔ تو اچھا ہے۔

میں نے [illegible] فاطمہ [illegible] صاحب کو لکھا ہے کہ وہ گھر آ کر میری نظمیں نقل کریں۔ اور پھر میرے پاس مسودہ [illegible] کے لئے بھجوا دیں۔ تاکہ پبلشر کو دیا جائے۔

انہیں میری [illegible] سے جانے دینا۔ وہاں بیٹھ کر ایک دو چھٹیاں صرف کر کے نقل کریں تو اچھا ہے۔

بچوں کو پیار۔ بلو کو بہت بہت دعائیں۔ زکیہ اور [illegible] بچوں کو دعائیں۔

تمہارا

راشد